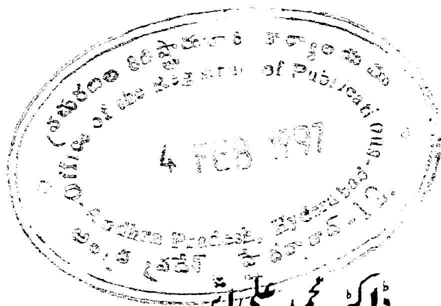
نوادرات تحقیق

(تحقیقی و تنقیدی مضامین)



ڈاکٹر محمد علی اثر
استاد شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی

سال اشاعت : ۱۹۹۶ء
مطبع : ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، ماونٹ روڈ ۔ مدراس ۔ ۲
کمپیوٹر کتابت : شارپ کمپیوٹرس ۔ محبوب بازار ۔ چادر گھاٹ، حیدرآباد ۲۴ ۔ فون: 4574117
صفحات : ۱۷۶
تعداد : ۵۰۰
قیمت : ۱۰۰ روپے
ناشر : ادارۂ شعر و حکمت 2/659-3-6 کپاڈیہ لین، سوماجی گوڑہ ۔ حیدرآباد ۔ ۴
ترتیب و تزئین : ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خاں، م ۔ ق ۔ سلیم

NAWADIRAT. E. TEHQEEQ
Dr. MOHAMMED ALI ASAR
PRICE RS. 100/=
1996

اس کتاب کی اشاعت میں آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کی جزوی مالی اعانت شامل ہے۔

ملنے کے پتے:

- مصنف: 9/226-4-20 ، محبوب چوک، حیدرآباد ۔ ۲ ۔ فون: 560338
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز ۔ لال کنواں، دہلی
- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ ۔ دہلی ۔ بمبئی ۔ علی گڑھ
- حسامی بک ڈپو ۔ چار کمان، حیدرآباد ۔

انتساب

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام

فہرست

ابتدائیہ

پیش نظر کتاب راقم السطور کے ان تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے جو گذشتہ تین چار سال کے عرصے میں سپرد قلم کیے گئے۔ بیشتر مقالے، عثمانیہ یونیورسٹی، سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد اور ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سمیناروں، ادبی اجلاسوں اور سمپوزیم میں پڑھے گئے اور بعد کو وقتاً فوقتاً ہندوپاک کے مختلف رسائل کی زینت بنتے رہے۔ کتابی صورت میں پیش کرتے ہوئے اب ان پر نظر ثانی بھی کی گئی ہے۔

اس کتاب کے بیش تر مضامین دکنی ادب کی تحقیق و تنقید اور بازیافت سے متعلق ہیں۔ خصوصاً غوثی ارکاٹی اور محمد باقر آگاہ ویلوری کی حیات اور شاعری کا جدید تحقیق کی روشنی میں مبسوط جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اسی طرح شغلی بیجاپوری کا غیر مطبوعہ کلام بھی پہلی بار منظر عام پر لایا گیا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی "دکنی کے چند نایاب مراثی" بھی ہے، جس میں گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے دکنی شعراء کے نادر و نایاب مراثی پہلی مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہوئے ہیں۔ خمریات اردو شاعری کا ایک اہم موضوع ہے اور اس پر خاصا کام بھی ہوا ہے۔ لیکن دکنی شاعری کی خمریات پر کسی بھی محقق یا نقاد نے نظر نہیں ڈالی راقم الحروف نے "دکنی شاعری میں خمریات" کے عنوان سے اس خلاء کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیگر مضامین بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے مطالعہ کی کسی نہ کسی نئی جہت کا اضافہ کرتے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے اس کتاب میں دکنی زبان و ادب کے جن موضوعات کا خاص طور پر احاطہ کیا گیا ہے، ان کے پیش نظر مجھے امید ہے کہ یہ کتاب قدیم اردو کے محققین اور ریسرچ اسکالرز کے لیے ممد و معاون ثابت ہوگی۔

میں استاد محترم پروفیسر مغنی تبسم کا ممنونِ کرم ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

میرے شاگردانِ عزیز ڈاکٹر سید عباس متقی اور ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں، جنھوں نے اس کتاب کی اول تا آخر پروف خوانی کی اور علی الترتیب قطعہ تاریخ تصنیف اور سوانحی کوائف قلم بند کیے۔

محمد علی اثر

ریڈر شعبۂ اردو۔ جامعہ عثمانیہ

پروفیسر مغنی تبسم

پیش لفظ

موجودہ دور میں ڈاکٹر محمد علی اثر ان معدودے چند محققین میں سے ایک ہیں جنھوں نے دکنی زبان و ادب کو اپنے تحقیقی کام کی خاص جولان گاہ بنایا ہے۔ اب ان کا شمار دکنیات کے چند اہم ماہرین میں ہونے لگا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے جہاں دکنی کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بعض پرانی تحقیقات کو غلط ثابت کیا ہے اور نئی معلومات بہم پہنچائی ہیں وہیں دکنی کے بعض ایسے شاعروں اور ادیبوں کو دریافت کر کے ان کے کارناموں سے روشناس کروایا ہے جن پر پہلے کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ دکنی کے بعض معروف ادیبوں اور شاعروں کی غیر مطبوعہ تخلیقات بھی ان کی تلاش و جستجو سے منظرِ عام پر آسکیں۔

ڈاکٹر محمد علی اثر مخطوطات شناسی میں مہارت رکھتے ہیں۔ قدیم قلمی کتابوں بالخصوص دکنی مخطوطات کو پڑھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس کے لیے مختلف خطوں اور کاتبوں کے انداز تحریر سے واقفیت کے علاوہ دکنی زبان پر کامل عبور رکھتے ہوئے دکنی الفاظ کے تلفظ سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ دکنی شعرا ضرورت شعری کی بنا پر لفظوں کا تلفظ بدل دیا کرتے تھے۔ اکثر ساکن حرف کو متحرک اور متحرک حرف کو ساکن کر دیتے۔ دکنی کے ان محققین نے جو عروض سے نابلد ہیں دکنی شاعری کی تدوین میں بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ماہر دکنیات ہونے کے ساتھ وہ شاعر بھی ہیں۔ موزونیت کے احساس کی وجہ سے دکنی شاعری کی تدوین میں ان سے کبھی چوک نہیں ہوتی۔

زیرِ نظر مجموعے میں زیادہ تر مضامین دکنیات سے متعلق ہیں۔ اور یہ سارے مضامین معلومات آفریں ہیں۔ غوثی ارکاٹی اور باقر آگاہ ویلوری پر ان کے مضامین تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی اثر قدیم بیاضوں اور قلمی نسخوں کی چھان بین کرکے کئی دکنی شاعروں کے نایاب کلام کو منظرِ عام پر لا چکے ہیں۔ دکنی کے چند نایاب مراثی اور شغلی بیجاپوری کا غیر مطبوعہ کلام بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

گزشتہ برسوں میں دکنی کلچر کی تحقیق پر دانشوروں اور علما کی توجہ مبذول ہوئی ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام دکنی کلچر پر دو روزہ سمینار کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ گزشتہ سال یومِ محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے موقع پر قطب شاہی سلاطین کے کارناموں پر ایک سمینار منعقد کیا گیا تھا۔ سمیناروں میں جو مقالے پڑھے گئے انھیں "سب رس" میں شائع کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور دکنی کلچر کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مجموعے میں شامل دو مضامین عہدِ عبداللہ قطب شاہ کے علمی ادبی اور تہذیبی کارنامے اور عادل شاہی سلاطین کے ادبی اور تہذیبی کارنامے قابلِ مطالعہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی اثر کا ایک اہم تحقیقی کام ولی اورنگ آبادی کی کتابیات ہے۔ انھوں نے ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک کے کتب خانوں میں مخزونہ ولی کے دواوین اور کلیات کے قلمی نسخوں کی مکمل فہرست مرتب کی ہے۔ ان میں سے صرف چند مخطوطات کلیاتِ ولی کے تدوین کاروں کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ ولی کے مطبوعہ دواوین میں اختلافاتِ نسخ بہت ہیں۔ ایک مستند کلیاتِ ولی کی تدوین کے لیے ان تمام قلمی نسخوں کا مطالعہ ضروری ہے یہ ایک بڑا پروجیکٹ ہے جسے کوئی بڑا علمی ادبی ادارہ ہی ایک سے زیادہ محققین کی مدد سے تکمیل کو پہنچا سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے اس کے لیے ایک بنیاد فراہم کردی ہے۔

اس مجموعے کا ایک اہم مضمون "ادبی تحقیق کے مسائل ۔ دکنی ادب کے حوالے سے" ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے تحقیق کے مختلف مراحل اور خاص طور

پر ترتیب و تدوین متن کے مسائل سے بحث کی ہے اور مختلف محققین کی فرو گذاشتوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ جہاں تک دکنی ادب کے متون کی تدوین کا تعلق ہے یہ کام بہت بڑے پیمانے پر انجام دیا گیا ہے۔ محققین نے بے شمار مخطوطات کو مدون کر کے شائع کیا ہے لیکن یہ سارا کام انفرادی طور پر من مانی انداز میں کیا گیا۔ دکنی تلفظ اور املا کے تعین کے بنیادی کام پر توجہ نہیں کی گئ۔ دکنی کے محققین کا وطیرہ یہ رہا ہے کہ وہ قلمی نسخے کی ہو بہو نقل کر دیتے ہیں۔ قدیم نسخوں میں کاتبین یائے مجہول اور یائے معروف میں فرق روا نہیں رکھتے تھے۔ ایک ہی نسخے میں ایک ہی لفظ کہیں یائے معروف سے اور کہیں یائے مجہول سے لکھا ہوا ملتا ہے اور متن کے مرتبین بھی مکھی پر مکھی بٹھا دیتے ہیں۔ قدیم دکنی میں ہکار حروف کو غیر ہکار بنانے کا رجحان تھا جیسے، تجھ کو تج کچھ کو کچ پوچھ کو پوچ کر دینا علیٰ ہذا القیاس اکثر قلمی نسخوں میں یہ الفاظ ہائے مخفی کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔ محقق کو یہ طے کرنا چاہیے کہ مصنف کے عہد کی زبان میں یہ حروف ہکار تھے یا غیر ہکار یعنی تجہ تج ہے یا تجھ لیکن محققین نے اس مسئلے کی طرف توجہ نہیں دی وہ قلمی نسخے کے "تجہ" کو "تجہ" ہی تحریر کرتے ہیں۔ قاری کی بالکل رہنمائی نہیں ہوتی کہ وہ اسے تجّ پڑھے یا تجھ۔

ڈاکٹر محمد محمد علی اثر جیسے پختہ کار محققین سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ان بنیادی مسائل پر توجہ دیں گے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کا یہ مجموعہ مضامین "نوادرات تحقیق" اہلِ علم و دانش کے لیے گراں قدر تحفہ ہے امید ہے کہ اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہو گی۔

مغنی تبسم

غوثی ارکاٹی۔ قدیم اردو کا ایک قادر الکلام سخن ور

غوثی دکنی اردو کا ایک قادر الکلام اور پر گو سخن ور ہے، جس کی تصانیف میں قصص الانبیا کے موضوع پر زائد از ساڑھے بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ایک ضخیم مثنوی کے علاوہ مناقب شیخ عبدالقادر جیلانی کے موضوع پر "ریاض غوثیہ" اور "غوثیہ" کے نام سے دو منظومات، "ضیافت نامہ۔ حضرت محمدؐ" کے زیر عنوان ایک قصیدہ اور قدیم اردو نثر میں پارۂ عم کی تفسیر (تفسیر غوثی) کا پتہ چلتا ہے۔

غوثی کا تذکرہ سب سے پہلے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "مدراس میں اردو" میں کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "شاہ غوثی ارکاٹ کے باشندے صوفی منش آدمی تھے۔ ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہوا" (۱) کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست میں "ریاض غوثیہ" کے مصنف کی حیثیت سے غوثی کا تعارف کرواتے ہوئے انھوں نے اطلاع دی ہے کہ "شاہ غوثی حیدر آباد کے شاعر ہیں" (۲)۔ اور پھر جب انھوں نے کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ سنٹرل لائبریری) کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کی تو غوثی کی اسی مثنوی کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شاہ غوثی کو بیجاپور سے تعلق تھا" (۳)۔

غوثی کے وطن کے بارے میں مولوی نصیر الدین ہاشمی کے مذکورہ تینوں بیانات متضاد ہیں۔ ایک میں انھوں نے غوثی کو ارکاٹ کا باشندہ بتایا ہے۔ دوسرے میں حیدر آباد کا متوطن لکھا ہے اور تیسرے میں ان کا تعلق بیجاپور سے بتایا ہے (۴)۔

نصیر الدین ہاشمی، غوثی کے مکمل نام سے بھی ناواقف تھے۔ اسی لیے انھوں نے کہیں شاعر کا نام شاہ غوثی لکھا ہے اور کہیں غوث جامی۔ ہاشمی صاحب کی تقلید میں ڈاکٹر زور (۵)، ڈاکٹر افضل اقبال (۶) اور کاوش بدری (۷) نے بھی غوثی کا نام شاہ غوثی یا غوث جامی تحریر کیا ہے۔

غوثی تخلص کے درج ذیل پانچ شاعروں کا پتہ چلتا ہے:

١۔ غوثی: غلام حسین ، محمد عتیق اللہ لقب ابن محمد امام قادری مرید و خلیفہ شاہ احمد اللہ قادری ۔ مصنف "فوائد المعرفت رحمانی" (١٢٣١ھ) ۔ مترجم "منہاج ابن حجر" (٨)

٢۔ غوثی: فخرالدین گجراتی ۔ احمد آباد کے مشائخ خاندان سے تعلق رکھتے تھے (٩) ۔

٣۔ غوثی: محمد غوث ابن قطب الدین قاضی، حیدر آبادی (١٠) ۔

٤۔ غوثی: میر احسن اللہ (١١) چنگل پیٹی ۔ مصنف "شہادت جنگ سلطانی" (١٢١٦ھ) (١٢) ۔

٥۔ غوثی: سید محمد غوث قادری المعروف بہ غوث جائی ۔ ابن افصحی آرکاٹی ، شاگرد و مرید حضرت سر اللہ انترجامی بغدادی متوفی ١١٧١ھ) (١٣) ۔

آخر الذکر دونوں شعرا ہم عصر ہیں اور ان کی زبان و بیان میں بھی بڑی حد تک یکسانیت نظر آتی ہے ۔ اس لیے غوثی آرکاٹی سے پہلے یہاں غوثی چنگل پیٹی کا سرسری تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ بہ قول ڈاکٹر آمنہ خاتون میر احسن اللہ غوثی چنگل پیٹ کا رہنے والا تھا جو مدراس کے جنوب مغرب میں چھتیس میل کے فاصلے پر واقع ہے (١٤) ۔ مثنوی شہادت جنگِ سلطانی کے درج ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ غوثی چنگل پیٹی کو "شاہ محمد علی" نے "راہ ہدایت" دکھائی اور "ملا شریف اور "بندے علی شاہ" نے بالترتیب اسے صرف و نحو اور تصوف کی تعلیم دی:

مرے تھے شاہ استاد محمد علی   کروں کیا میں تعریف بے شک ولی

تھے محمود بندر میں ملاں شریف   فضیلت سزاوار تھی ان کے تئیں (١٥)

[کذا]

....

کتب نحو و تصریف تصنیف کی   عجب فیض ان کا جو تعریف کی (١٦)

....

اتھے ایک درویش عالی مقام   شب و روز تھا فقر و فاقے سے کام

تھا بندے علی شاہ مشہور نام   شب و روز حاضر تھا غوثی غلام (١٧)

غوثی چنگل پیٹی نے یہ مثنوی اپنے ایک دوست محمد غفور ویلوری کی فرمائش پر تصنیف کی تھی:

کہے دوست میرے مجھ تھے شتاب   کہو جنگ شاہ کا ، بناؤ کتاب

رہن ہار ایلور مشہور تر محمد غفور اسم ان کا لکر (۱۸)

"شہادت جنگ سلطانی" ۶۷۵/ ابیات پر مشتمل ہے۔ شاعر نے اس مثنوی کو پچیس داستانوں میں منقسم کرکے ہر داستان کی سرخی کے طور پر ایک ہم قافیہ شعر (مطلع) لکھا ہے۔ جس کی بحر مثنوی کی بحر سے مختلف ہے۔ درج ذیل اشعار سے مثنوی کی تاریخ تصنیف اور تعداد اشعار کا پتہ چلتا ہے:

ہزار ایک دو سو بھی سولا میں سال   مرتب کیا ماہ رجب کمال
کیا داستاں جب کتاب پنج بیس   کیا بیت چھ سو پنجاہ پچیس (۱۹)

راقم الحروف کے خیال میں میر احسن اللہ غوثی اور سید محمد غوث غوثی دو علاحدہ شخصیتیں ہیں۔ سید محمد غوثی مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری کے رفقاء خاص میں شمار ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باقر آگاہ کی متعدد تصانیف کے آخر میں ان کی تاریخی نظمیں اور قصیدے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو منظومات کی سرخیاں ملاحظہ ہوں:

۱۔ قصیدہ در تعریف "حسرت عشق" (باقر آگاہ) از سید محمد غوث غوثی (۲۰)

۲۔ تاریخ "حیرت عشق" (باقر آگاہ) از سید محمد غوث غوثی (۲۱)

مندرجہ بالا شواہد کی روشنی میں غوثی کا پورا نام سید محمد غوث قرار پاتا ہے۔ جہاں تک غوثی کے وطن کا تعلق ہے اس کے کلام کی اندرونی شہادتیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ وہ محمد پور (ارکاٹ) کا باشندہ تھا اور غالباً اپنے مرشد حضرت سر اللہ انترجامی کے نام کی مناسبت سے غوث جامی کے نام سے مشہور تھا۔

محمد پور کا غوثی رہن ہار   کتے ارکاٹ جس بلدے کو اظہار
تخلص جس کا غوثی ہے مذکور (؟)   ولے ہے غوث جامی نام مشہور (۲۲)

غوثی کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے والد افصحی تخلص کرتے تھے اور انھوں نے "نوبہار" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی:

باپ کا سن نام مج اب اے عزیز   فاتحہ پڑ کر ہے تج میں (کچ) تمیز
افصحی مج باپ ہے، ہور میں غلام   جس فضیلت کا تھا دکھن بیچ نام
طبع کا تھا جس کی ایسا کچ عروج   روح بی واں لگ نہ پونچے کر خروج
گر کرے پھلبن میں او سحر حلال   عندلیب ہو گنگ بھولے قیل و قال

شعر اس کا سلک جاں کا ہے درر　　آبرو کھویا ہے جس کے کن گہر
او کھلایا ہے اچنبا " نو بہار "　　عاشقان قرباں ہیں جس پر نت ہزار (۲۳)

آگے چل کر وہ یہ بھی اطلاع دیتا ہے کہ اس کے والد ہاشم پیر کے نواسے تھے اور وہ یادِ حق، سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہیں تھے۔ رحم دلی اور معصومیت ان کے اوصاف تھے:

خلق خوش سوں بحر ہو پھل نیر کا　　تھا نواسہ او سو ہاشم پیر کا
یادِ حق سوں تھا نہ غافل ایک تل　　تھی صفت معصوم کی ہور رحم دل (۲۴)

افصحی بیجاپوری کے نانا حضرت ہاشم حسینی علوی معروف بہ ہاشم پیر محمد ابراہیم عادل شاہ اور محمد عادل شاہ کے مرشد اور وجیہہ الدین علوی گجراتی کے برادر زادہ تھے (۲۵)۔ افصحی بیجاپوری کی تصنیف " نوبہار " نایاب ہے لیکن ان کی ایک اور مثنوی " وفات نامہ۔ نبیؐ " کا پتہ چلتا ہے، جس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ کی زینت ہے (۲۶) اس مثنوی میں بھی ہاشم پیر کا ذکر ملتا ہے:

پیا سو کون ہاشم پیر تیرا　　سو کے دل کے چمن کوں نیر میرا (۲۷)

افصحی نے غزلیں اور مرثیے (۲۸) بھی لکھے ہیں۔ درجِ ذیل غزل کے چند اشعار سے ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

جو سندر صبح کو آکر چھجے کیری اپر نکلے
لیا او مکھ سرج کو ہے جو تس آنگے سحر نکلے
یہ البیلی نکل آنے۔ ذوجگ سدبد بھلائی ہے
نہ جانو تب کہ کیا ہوئے کہیں سندر سنور نکلے
اگر پڑ علم نیہ مجنوں ہوا ہے افصحی سب تم (۲۹)
ہنسو مت، عشق مکتب میں گیا سو بے خبر نکلے

درجِ ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ غوثی کے والد افصحی نے " ریاضِ غوثیہ " کی تصنیف (۱۱۶۹ھ) سے چار سال قبل یعنی ۱۱۶۵ھ میں وفات پائی:

جب کہ او اس عالمِ فانی میں تھا
دل مرا غفلت کے تب بانی میں تھا

واقعہ ہو اس کا گزرے چار سال
پن ہوانئیں کم مرا ہرگز ملال
آہ مج بابا کا جب تک جان تھا
گھر مرا گوہر کا گویا کان تھا
بس کر اب غوثی توں کاں لگ روئے گا (۳۰)
رات دن رورو کے انکھیاں کھوئے گا

غوثی نے اپنے کلام میں یہ بھی اطلاع دی ہے کہ ان کی والدہ، اپنے شوہر (افصحی) کی وفات کے ۲۳ سال بعد، جب کہ وہ ایک اور مثنوی "غوثیہ" (۱۱۸۸ھ) تصنیف کر رہے تھے بہ قیدِ حیات تھیں۔ وہ اپنی والدہ کی بہت عزت اور تکریم کرتے تھے اور متمنی تھے کہ ان کے بچے بھی اپنی دادی کی خدمت کریں کیوں کہ وہ ایک عبادت گزار اور نیک سیرت خاتون تھیں:

سو وہ قوم میں، رابعہ عصر ہیں
او بیبیاں منے عابدِ دہر ہیں
وہ واصل ہیں، عابد ہیں شب زندہ دار (۳۱)
خدا کی تجلی انوں پر ہزار

غوثی کے کلام کی اندرونی شہادتیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ وہ دکنی اردو کے باکمال شاعر اور انشاپرداز مولانا باقر آگاہ ویلوری کے قریبی احباب میں شامل تھے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے مولانا آگاہ کی تقریباً تمام کتابوں کے آخر میں مدحیہ نظمیں یا قطعہ ہائے تاریخ تحریر کیے ہیں۔ وہ ایک درویش صفت، سنی المذہب اور قادری المشرب بزرگ تھے۔ "غوثیہ" کی تصنیف (۱۱۸۸ھ) کے وقت ان کی اولاد کمسن تھی اس کتاب کے آخر میں وہ اپنی اولاد کو مخاطب کر کے انھیں صوم و صلواۃ کی پابندی کرنے، خدا کے خوف سے ڈرنے، جاہلوں کی صحبت اختیار نہ کرنے، ابلیس پر ہمیشہ لاحول بھیجنے، جوا نہ کھیلنے، عالموں کی صحبت اختیار کرنے، غیبت سے بچنے، یتیموں سے اچھا سلوک کرنے اور مہمان نوازی کرنے کی نصیحت کرتے ہیں:

اگرچہ مج اولاد ہے سن صغیر ہے امید حق سوں ہووئے گی کبیر

ترک صوم و رمضان کوں مت کرو　　اپس دل میں خوف خدا نت دھرو

....

رکھو یوچ صحبت سوں اپنے کوں دور　　نکو نرد پھیکو سمج کر سرور
عدو آدمیں کا سو ابلیس ہے　　او مردود پر مکر تلبیس ہے
کرو صحبتِ عالماں اختیار　　انن کا ہوے تم پو تا فیض بار
کلامِ الٰہی کرو خوب یاد　　ہے حافظ کا درجہ نہایت زیاد
نکو عیب کس کا کرو آشکار　　رہو دور غیبت سیتے باوقار
یتیماں یسیراں سوں نیکی کرو　　نظر نت شفقت کی ان پر دھرو
ضعیفاں پو نیکی کرو بے شمار　　دھرو زیر دستاں اپر بھوت پیار
رکھو بھوت مہمان کوں دوست تر　　دیوے حق سو ان کوں کھلاؤ مگر (۳۲)

غوثی نے قدیم اردو کے دیگر شاعروں کی طرح اپنا تخلص غوثی اور غوثیا دونوں طرح استعمال کیا ہے:

یو غوثی انبیاں کا ذکر اکثر　　محباں سات کرتا تھا نکو تر

....

حاسداں کو دے حسد کی آگ　　غوثیا توں لے قلم کی باگ

مثنوی "ریاضِ مسعود" میں غوثی نے والاجاہ کی مدح میں اشعار کہے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نواب والاجاہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے:

اتا کہتا ہوں وصفِ شاہ اعظم　　ہمارے ملک کا سلطاں مکرم
ہے والا جاہ اب شاہِ زمانہ　　جہاں میں جس کی ہمت کا فسانہ
وہ طالع میں ہے ثانیِ سکندر　　شجاعت میں ہے رستم سوں بھی برتر
ہے غوثی بھوت ساشہ کا قرض دار　　نہ کوئی کرتا برا، احوال اظہار
یو والا جاہ کا منظور نظر کر　　مراد اس میں مری حاصل ہے یکسر (۳۴)

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب والاجاہ نے ان کی قدر افزائی اور سرپرستی نہیں کی۔ چناں چہ مثنوی "قصص الانبیا" اور "غوثیہ" میں ان کے مقروض اور مفلوک الحال

ہونے کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غوثی اپنے بھائیوں سے بچھڑ گئے تھے۔ وہ بارگاہِ الہیٰ میں دست بہ دعا ہیں کہ بہت جلد قرض سے سبک دوش ہو جائیں اور ان کے بچھڑے ہوئے بھائی انھیں مل جائیں:

کرو قرض میرا ادا غوثِ پاک — رکھو یادِ حق میں مجے تا ہلاک (۳۴)

....

الہیٰ میں نہایت ہوں گنہہ گار — ہوا ہوں بھوت عالم کا قرض دار
مرے بھایاں پڑے ہیں مج سیتے دور — انو کے ہجر میں ہوں روز و شب چور
ملے ہیں جوں کہ یوسف سار یعقوب — مرے بھایاں ملانا صورت خوب
الہیٰ گرچہ ہوں تیرا گنہہ گار — ولے تیرا ہوں بندہ تو ہے غفار
بخش مرا گناہ رکھ سات لماں — ادا کر قرض سب غوثی کا رحماں (۳۵)

مولوی نصیر الدین ہاشمی کا بیان ہے کہ غوثی نے ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا اور ان کا مزار ان کے پیر و مرشد حضرت سر اللہ انترجامی کے مزارِ مقدس کے رو بہ رو ہے (۳۶) "بہار اعظم جاہی" کے مؤلف نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ غوثی کے پیر و مرشد شہر بغداد کے متوطن تھے، ان کا نسب نامہ مادری و پدری حضرت غوث الوریٰ پر منتہی ہوتا ہے۔ حضرت انترجامی عہدِ نواب سعادت اللہ خاں (متوفی ۱۷۳۲ء) کے اواخر میں ارکاٹ تشریف لائے اور "لالہ پیٹ" کی پہاڑیوں پر سکونت پذیر ہو گئے۔ (۳۷)

غوثی ایک قادر الکلام شاعر اور نثر نگار تھا۔ اب تک اس کی درجِ ذیل پانچ کتابیں دست یاب ہوئی ہیں:

۱۔ ریاضِ غوثیہ (۱۱۶۹ھ) — ۲۔ غوثیہ (۱۱۸۸ھ)
۳۔ قصص الانبیا (۱۱۹۱ھ) — ۴۔ ضیافت نامہ
۵۔ تفسیر غوثی (۳۸)۔

۱۔ ریاضِ غوثیہ: ۵۷۶۰/ ابیات پر مشتمل اس مثنوی کے آٹھ قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے جن میں سے چار نسخے انجمن ترقیِ اردو کراچی کے کتب خانے کی زینت ہیں اور ایک

ایک نسخہ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری ۔ حیدرآباد ۔ کتب خانہ۔ سالار جنگ ۔ حیدرآباد، ادارۂ ادبیات اردو ۔ حیدرآباد اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے کتب خانے کا مخزونہ ہے۔ "ریاض غوثیہ" کے نام سے ظاہر ہے کہ اس مثنوی میں شاعر نے محبوب سبحانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے سوانح اور مناقب کو موضوع سخن بنایا ہے۔ درج ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اسی موضوع پر لکھی ہوئی فارسی تصنیف "مناقب غوثیہ" کا دکنی ترجمہ ہے جسے غوثی نے اپنے ایک دوست غلام محی الدین کی فرمائش پر سپرد قرطاس کیا ہے:

یک محب میرا محی الدیں کا غلام　　تھا غلام محی دیں کر اس کا نام

سو او یک دن اپنے دل کا مدعا　　مج سوں یوں بولا تھا لئی التجا

ہے "مناقب غوثیہ" جو فارسی　　اس کوں ہندی بول کر جوں آرسی

اس مثنوی کے آغاز میں غوثی نے لکھا ہے کہ قدیم سخن وروں اور نثرنگاروں نے مختلف اصناف ادب میں اپنا زور قلم دکھایا ہے۔ کسی نے کہانی لکھی ہے تو کسی نے قصہ گوئی میں کمال حاصل کیا ہے۔ کسی نے قصیدہ گوئی کے فن میں "گوہر رولے ہیں" تو کسی نے مخمس، مستزاد اور ترجیع بند میں اپنا کمال دکھایا ہے۔ کوئی غزل گوئی میں مہارت حاصل کر کے صاحب دیوان ہوا ہے، کسی نے نثرنگاری کے میدان میں اپنا مقام پیدا کیا ہے اور کسی نے "زنانی شعر" کہہ کر اپنے فن کا لوہا منوایا ہے ۔ لیکن میں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے اور یہ راہ مجھے مثنوی مولانا روم نے دکھائی ہے:

کوئی کہانی کوئی قصہ بول گئے　　کوئی قصائد بیچ گوہر رول گئے

کوئی مخمس کوئی بولیا مستزاد　　کوئی ترجیع بند میں پایا مراد

کوئی غزل کہہ صاحب دیواں ہوا　　نثر کا کاغذ کوئی لایا چوا

کوئی زنانی شعر بولا ذوق سوں　　کوئی مردانہ کیا ات شوق سوں

بحر جس کے دل کوں جیسا خوش لگیا　　اس میں ہو غواص او گوہر چنیا

میں ولیکن بحر میں کس نئیں ملیا　　سب سوں نیارا راہ لے اپنی چلیا

بحر منج نادر پڑی ہے دھوم کا　　مثنوی مولوی روم کا

بحر کوں اس کم نہ جان اے یار توں — ہے عمیق پر [پر] درِ شہوار سوں
اب براکو مج کوں یا، کوئی بھلا — میں چلا اس بحر میں گھوڑا چلا (۴۰)

اس مثنوی میں غوثی نے اپنے والد افصحی کے علاوہ دبستان بیجاپور اور گولکنڈے کے چند ایسے باکمال سخن وروں کا تذکرہ کیا ہے۔ جو "ریاض غوثیہ" کی تصنیف کے وقت بہ قید حیات نہیں تھے۔ ان شعرا میں ملک الشعرا نصرتی، ہاشمی بیجاپوری، ملک الشعرا ملا غواصی اور سید محمد فراقی اور ان کی مشہور زمانہ مثنویوں "گلشن عشق"، "یوسف زلیخا" "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور "مراۃ الحشر" کے نام شامل ہیں:

نصرتی جو بحر گلشن میں ہنگ — گوہر مقصود لایا اپنے سنگ
افصحی ہو عندلیب خوش نوا — نوبہار اپنا کھلایا بے بہا
پھر غواصی "قصہ۔ سیف الملوک" — کہہ گیا کہ شعر کے فن سوں سلوک
دھر فراقی وصل رب کا اشتیاق — او "مراۃ الحشر" بولیا لے فراق
ہاشمی بولیا "زلیخا" ذوق سوں — عشق میں چک رو کے کھویا شوق سوں
سب او اپنی طبع کا جودت دکھا — چھوڑ گئے آخر کوں یہ فانی سرا (۴۱)

مندرجہ۔ بالا اشعار کی روشنی میں مولوی سخاوت مرزا نے "ریاض غوثیہ" کے زمانہ۔ تصنیف کا تعین کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "ممکن ہے کہ اس نے ان میں سے بعض شعرا کو دیکھا ہو، اس کی یہ تصنیف فراقی بیجاپوری (کی) وفات کے بعد کی ہے اور یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ غوثی "فراقی بیجاپوری تقریباً ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) کا ہم عصر اور وسط بارھویں صدی ہجری کا بیجاپوری الاصل شاعر ہے اور میر تقی میر اور سودا کا معاصر ہے۔" (۴۲) مولوی نصیرالدین ہاشمی نے "ریاض غوثیہ" کی تاریخ تصنیف ۱۱۹۱ھ تحریر کی ہے (۴۳)۔

مولوی سخاوت مرزا کا یہ کہنا بڑی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ غوثی بارھویں صدی ہجری کے ربع دوم کا شاعر اور میر و سودا کا ہم عصر تھا لیکن اسے بیجاپوری الاصل قرار دینا گویا خود شاعر کے بیان کی تردید کے مترادف ہے۔ غوثی نے اپنی مثنوی "قصص الانبیا" کے درج ذیل اشعار میں خود کو محمد پور (ارکاٹ) کا متوطن لکھا ہے۔

محمد پور کا غوثی رہن ہار — کتے ارکاٹ جس بلدے کو اظہار

تخلص جس کا غوثی ہے مذکور   ولے ہے غوث جامی نام مشہور (۴۴)

جہاں تک " ریاضِ غوثیہ " کی تاریخ تصنیف کا تعلق ہے مذکورہ بالا دونوں محققین کے بیانات درست نہیں ہیں کیوں کہ خود غوثی نے "عندلیبِ باغ " کے اعداد سے اس مثنوی کی تاریخ تحریر ۱۱۶۹ھ نکالی ہے:

اس کی دھر تاریخ کا پھر میں خیال   جب جنابِ قدس میں کیتا سوال
تب کرم کر مج پو ہاتف غور سوں   کان میں دل کے کہا اس طور سوں
باغ یو باغاں کوں سارے داغ ہے   اس کی تاریخ " عندلیبِ باغ " ہے (۴۵)

مثنوی " ریاضِ غوثیہ " کا آغاز " حمد " سے ہوتا ہے۔ پچاس حمدیہ اشعار کہنے کے بعد غوثی نے مناجات میں ۴۶، نعت رسولؐ میں ۴۸، معراج نبیؐ میں ۱۳۶، منقبت علی میں ۲۸/ اور منقبت محبوبِ سبحانی میں ۱۸ شعر لکھے ہیں اور پھر " ستائشِ سخن و سخن شناسانِ انصاف دوست و مذمت حاسدان بے مغزِ سراسر پوست " کے عنوان کے تحت ۴۶/ اشعار اور " روز و شب از درد مفارقت پدر خود نالیدن و از حصول علم بے بہرہ ماندہ دست تاسف مالیدن " کے زیرِ عنوان ۲۵ شعر کہے ہیں۔ مکمل مثنوی کو غوثی نے حضرت محبوبِ سبحانی کے عرس کی تاریخ کی مناسبت سے گیارہ ابواب میں منقسم کر کے ہر باب کو " چمن " کا نام دیا ہے اور ہر چمن کو گیارہ گلدستوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ذیل میں مذکورہ عناوین کے ابتدائی اشعار درج کیے جاتے ہیں:

حمدِ حق سوں ہونٹ اول کھولنا   بعد از اس کے دل منگیا سو بولنا

....

قادرا قادر ہے توں قدرت مآب   فضل سوں تیرے ہے ہر یک فیض یاب

....

نعتِ احمد حمد پچھے ہے ضرور   سب نبیاں کے بعد جس کا ہے ظہور

....

زلفِ جاناں سوں لے خوش بو یک رین   عطر یا عنبر تھی یا مشکِ ختن

....

اے دلِ شیدا مرے ٹک بول اب   کس کا عاشق ہے سو مجھ پو کھول اب

....

منقبت بولوں گا اب تجھ پیر کا غوث الاعظم ہادیِ گنبھیر کا

....

اے در دریائے دل یعنی سخن فیض سوں تجھ ہے مزین ہر کرن

....

حسبِ حال اپنا تو اے دل بول رے سل زبان کے تیغ کا مک کھول رے (۴۶)

مثنوی " ریاض غوثیہ " کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے جگہ جگہ متعدد اقسام کے پھولوں پھلوں اور پرندوں کا تذکرہ کرکے منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

هر چمن پھولاں سوں مالا مال ہے پھول ہیں کئیں زرد ہور کئیں لال ہے
عیش کا صد برگ دے صد برگ کوں رخ پہ ہر گل رخ کے بھیجا برگ کوں
کاکلِ سنبل تے گوندیا بال میں گال پر لالہ کے لایا خال میں
یاسمن کے عطر سوں برتر کیا بوکوں شبو کے سبوں پر موکیا
خوش نظر کے خوش نظر سوں تس سجا برگوں میں ریحاں کے لایا ارگجا
لاجھلے کوں موگرے کے موگری بیل کردیا میں باغ میں خوش بو کا کھیل
بھاگلِ اورنگ رنگ پر اک شہاب میں پنھایا اس کے تئیں سب سرخ باب
اشرفی سا خوش نما گل اشرفی ایک گل پر تھے فدا گل اشرفی
کیا گلِ قدوس کی خوبی بتاؤں بس ہے اس خوبی پہ شاہد اس کا پاؤں
چاندنی کے چند نے یو گلِ چاندنی اس پہ یہ نوری کی باندی چاندنی
شعلہ ہو گل نار کے گل نار گل لادیوے روشنی گل زار گل
یار سوں خوش بوئی ہوکر سیونتی سیونتی کی ہوے مرید آ ریونتی

....

گل کے جھاڑاں اس قدر اس میں لگا بن کوں پھر میویاں کے بج من اب چلیا
آنب کا ہے فیض جگ پر عام سب لحم سختی سوں بھریا ہے جام سب
باغ میں سب روت ہے شہتوت سوں باج پاتا میں ہے یاقوت کوں ؟
بول مت کھرنی کوں توں کھرنی ہے یو نئیں ہے یہ کھرنی مگر فرنی ہے یو

جیوں سیہ بختاں ہریک جامن نول ۔۔۔ ہے گگن پر جھاڑ کے جیسے زحل
بیر کو چھتا ہے پھردل بیر بیر ۔۔۔ سیرنا ہو بیرسوں کے بیر بیر
کیا قضا سوں مل قدر صنعت کرے ۔۔۔ درجک انار میں مرجاں بھرے
عشق سوں لیمو نہیں پیلا ہے کچ ۔۔۔ فکر ترشی کے لیے وہ ہیگا پچ

....

لحن داوٗدی جو طوطی جب رچائے ۔۔۔ بار ہدہ ہدہ کھوئے نمک سو گنوائے
قمریاں کوکو کے کوکو کوبہ کو ۔۔۔ ہے سبھی کے لک میں لک وہ سوبہ سو
سرخ کی کیا تیز پیاری ہے وہ بیل ۔۔۔ جیوں کبوتر باز کی نادر زفیل
کوک سے کوئل کے کرکے بن تمام ۔۔۔ درد سے دوکھوں سے دوکھے بن تمام
رقص سوں رقصاں ہیں طاوٗساں تمام ۔۔۔ شوق سوں سوزاں ہیں فانوساں تمام

۲۔ **غوثیہ:** غوثی ارکاٹی کی دوسری مثنوی "غوثیہ" ہے۔ اس کے کل ابیات کا علم نہیں ہو سکا۔ غوثیہ کے دو قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ناقص الاول نسخہ ادارۂ ادبیاتِ اردو (مخطوطہ نمبر ۷۳۹) کی زینت ہے اور دوسرا مکمل نسخہ انجمن ترقی اردو۔ پاکستان (مخطوطہ نمبر ۳۷۲(۳)) کا مخزونہ ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے افسر صدیقی نے اس مثنوی کے جملہ اشعار کی تعداد نہیں بتائی۔ البتہ درج ذیل اشعار نقل کیے ہیں جن سے "غوثیہ" کا آغاز ہوتا ہے:

الٰہی دونوں جگ کا آدھار توں ۔۔۔ ہمیں سب ہیں بندے نرنکھار توں
کیا کن میں منڈان سارا عیاں ۔۔۔ ہوا جلوہ گر تج سوں سارا جہاں
فلک کوں ملک سوں سنواریا تمام ۔۔۔ زمیں کوں دیا انس سوں زیب عام (۴۷)

"ریاضِ غوثیہ" کی طرح غوثی کی پیشِ نظر مثنوی کا موضوع بھی حضرت محبوبِ سبحانی کے مناقب اور اوصاف ہے۔ "غوثیہ" دراصل اسی نام کی ایک فارسی تصنیف کا دکنی اردو میں منظوم ترجمہ ہے (۴۸) غوثی نے یہ مثنوی ۱۱۸۸ھ میں رمضان المبارک کی ستائیس ویں شب (شبِ قدر) میں مکمل کی۔ تاریخِ تصنیف کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اتا لاتو تاریخ اوپر مزاج	جو تاریخ کوں بول کر ایس تاج
کہ کس سن میں ہوی انصرام یو کتاب	جو ہجری و نبوی میں عالی جناب
مفصل عبارت میں تاریخ کھول	بھی ایضاً حروفات میں اسکوں بول
ایگارا سو اسی اپر آٹ سال	و " روضۂ صفا " بیچ گن کر نکال
۱۱۸۸ھ	۱۱۸۸ = ۶ + ۱۸۸۲

کیا شہرِ رمضان میں اختتام	ستاویس ویں شب کی تھی نیک نام
شبِ قدر جس شب میں پروردگار	بخشتا ہے عاصیاں کے تئیں کرد گار (۴۹)

" غوثیہ " کے آخر میں شاعر نے اپنے بچوں کو مخاطب کر کے ایک " پند نامہ " تحریر کیا ہے جس میں نیکی، شرافت اور اخلاق کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان نصیحتوں کے درمیان غوثی نے بادشاہِ وقت کی صحبت سے پرہیز کرنے کی بھی ہدایت کی ہے:

نکو صحبتِ شہہ کرو اختیار	کہ سلطاں کی صحبت ہے مانند نار
رہنا آگ سوں دور بہتر ہے بات	کہ سلطان سوں ڈرنا ہے ولیچ بات (۵۰)

۲۔ قصص الانبیاء: غوثی کی یہ معرکتہ الآرا مثنوی ہے۔ جو بہ قول ڈاکٹر زور ساڑھے بارہ ہزار اشعار پر پھیلی ہوئی ہے اور اردو کی ضخیم ترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ قصص الانبیا دراصل اسی نام کی ایک فارسی تصنیف کا دکنی ترجمہ ہے " سببِ تالیف کتاب قصص الانبیا در زبانِ دکنی می گوید " کی سرخی کے تحت غوثی نے لکھا ہے:

یو غوثی انبیاں کا ذکر اکثر	محباں ساتھ کرتا تھا نکوتر
بجد مج کوں ہوکے سب اہل محفل	جو رکھتے تھے محبت دل سوں کامل
زباں دکنی منے اس نظم کوں بول	جو آوے فہم میں ہر اک کے تئیں کھول
مجھے تحریص سوں ان کے ہوا شوق	رہا نئیں چین یک تل لئی ہوا ذوق
قصص جو انبیا کا فارسی ہے	نصِ قرآن سوں جوں آرسی ہے
سو اس کا ترجمہ کرتا ہوں میں اب	مری تو طبع کر جولان یارب
اپس کے فضل سوں تو بخش الہام	کہوں تا نظم دکھنی بہ خوش افہام (۵۱)

قصص الانبیا کو غوثی نے تین دفتروں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے کا آغاز "قصص نور محمدؐ از احد تا آدمؑ احوال می گوید" سے ہوتا ہے پھر اس کے بعد حضرت آدمؑ سے حضرت ایوبؑ تک تمام انبیا کے واقعات حیات قلم بند کیے گئے ہیں۔ دوسرا حصہ سکندر ذوالقرنین سے حضرت عیسیٰؑ اور جمجمہ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ تیسرے اور آخری حصے میں غوثی نے حضور اکرم حضرت محمد صلعم کی سیرت طیبہ اور شمائل بیان کیے ہیں۔

مثنوی "قصص الانبیا" کے تینوں دفتروں پر مشتمل مکمل قلمی نسخے کتب خانہ سالار جنگ (حیدرآباد) کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد) اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ کراچی کی زینت ہیں۔ اس کے علاو دفتر اول کے دو نسخے کتب خانہ آصفیہ (اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری (حیدرآباد) میں اور ایک نسخہ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد) کا مخزونہ ہے اور دفتر دوم کا ایک نسخہ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) میں محفوظ ہے۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ ہند (دہلی) میں بھی اس مثنوی کے پانچ مخطوطے محفوظ ہیں۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ یہ "قصص الانبیا" کے کتنے دفتروں کا احاطہ کرتے ہیں۔

اس مثنوی کا تاریخی نام "ریاض مسعود" ہے جس سے سنہ ۱۱۹۱ھ مستخرج ہوتا ہے۔ درج ذیل اشعار میں غوثی نے صوری اور معنوی دونوں طریقوں سے اس مثنوی کی تاریخ تصنیف نکالی ہے:

برس ہجری اگیارا سو اکیانو بھرے پر یو بنیا ہے نسخہ نو
ہے نام اس کا سنو جو "ریاض مسعود ہے تاریخ اس اسم کے بیچ مشہور

"ریاض مسعود" میں تاریخ ظاہر اگیارا سو نود (پر) ایک نادر

مثنوی "غوثیہ" میں شاعر نے اپنے بچوں کو بادشاہ وقت کی صحبت اختیار نہ کرنے کی ہدایت کی تھی لیکن پیش نظر مثنوی کے آخر میں اس نے نہ صرف اپنے مقروض ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ نواب والاجاہ کی مدح بھی کی ہے۔ "والاجاہ" کو غوثی نے "شاہ زمانہ"، "شاہ اعظم"، "سلطان مکرم"، "ثانی سکندر" "رستم سوں بھی برتر" کے الفاظ

سے یاد کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

اتا کہتا ہوں وصف شاہ اعظم	ہمارے ملک کا سلطاں مکرم
ہے والا جاہ اب شاہ زمانہ	جہاں میں جس کی ہمت کا فسانہ
وہ طالع میں ہے ثانی سکندر	شجاعت میں ہے رستم سوں بھی برتر
دکن ہور ہندسوں محتاج آکر	لے جاتے ہاتیاں بھر در و گوہر
ہے غوثی بھوت ساشہہ قرض دار	نکوئی کرتا برا احوال اظہار
یو والا جاہ کا منظور نظر کر	مراد اس میں مری حاصل ہے یکسر

۴۔ ضیافت نامہ: غوثی نے قصیدے کی ہیئت میں ۱۰۴/ اشعار پر مشتمل ایک نظم "ضیافت نامہ" کے عنوان سے لکھی ہے۔ ضیافت نامہ کے دو قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے: ایک ادارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد) کی زینت ہے (۵۲) اور دوسرا کتب خانہ انجمن ترقی اردو (کراچی) کا مخزونہ ہے (۵۳)۔ قصیدے کا آغاز درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

اول کریم حق کی صفت ہے بعد ختم مرسلاں
ان پر درود رب ہو جو آل ہیں اصحابیاں
مرشد کے جو فرمان سے بولا روایت غوثیا
مرقوم ہے راوی سچی سننا ضیافت کا بیاں

اس سلسلے میں اس نے "ضیافت نامہ" کی فضیلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ اس قصیدے کے مطالعے سے قارئین کی مشکلیں آسان ہوجائیں گی اور اگر کوئی شخص اس نظم کو چالیس دن تک پڑھتا رہے تو اس کے گھر میں شادی ہوگی اور ترقی کے راستے کھل جائیں گے:

گردوں کی جد گردش منے آوے گا ہر کوئی امتی
پڑھنے ضیافت مصطفیٰ آسان ہوں گے مشکلاں
سچ ہے ضیافت مصطفیٰ چالیس دن جو کوئی پڑے
شادی ہووے اس گھر منے پاوے ترقی نعمتاں

اس نظم میں غوثی نے حضرت عثمان کے یہاں اور بعد ازاں خاتون جنت کے گھر رسول اللہ صلعم کی ضیافت کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں حضرت، حضرت عمر اور حضرت ابو بکر صدیق کے علاوہ متعدد اصحاب رسول مدعو تھے۔ چند اشعار دیکھیے:

عوت کیے عثمان نے یک دن پیمبر کی سنو
لے کر حکم سرور کا جو تیار کرتے کئی مکاں
سب کچ مہیا کرکے او بولے خبر سرور کو جا
سن کر چلے سرورنے لے ہم راہ سب اصحابیاں
شہہ مرتضیٰ، صدیق، عمر باقی اتھے کئی امتی
تھا شہر سب آراستہ مشتاق تھے وہاں سب جنیاں
کرتے قدم پر شاہ کے یک یک طبق گوہر نثار
ہر یک قدم پر یونچ ہیں بردے کئی آزاد جاں

"ضیافت نامہ" کا اختتام درج ذیل اشعار پر ہوتا ہے:

اے سرور شہہ انبیا اے فاطمہ خیرالنسا
دنیاں کی غفلت دور کر کرنا کرم برعاصیاں
عاصی ہے غوثی امتی اے فاطمہ بنت رسول
کرنا عطا بندے اپر ہر دو جہاں کے نعمتاں
ہے صدق جو عدل و حیا شیر خدا کا وے لگن
کر خاتمہ لمان سے اے خاتم پیغمبراں
مرشد کے جو ارشاد سے غوثی اتا پایا ظہور
جو کچھ کہ اس میں ہے صفت طاقت نہیں کرنے بیاں

۵۔ تفسیر غوثی: یہ غوثی کا ایک نثری رسالہ ہے جس میں "پارۂ عم" کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ "تفسیر غوثی" کا واحد نسخہ کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) کی زینت ہے (۵۴)۔ بہ قول نصیرالدین ہاشمی اس تصنیف کا آغاز سورہ عم یتسٓالون سے ہوتا ہے اور اختتام سورۂ فاتحہ پر۔ قرآن حکیم کی آیتیں سرخ روشنائی سے لکھی گئی ہیں اور اس کے

بعد لفظی معنیٰ کے ساتھ مختصر الفاظ میں تشریح کی گئی ہے (۵۵)۔

نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ۔ سالار جنگ اور کتب خانہ۔ آصفیہ کی وضاحتی فہارس میں دو منظومات "چکی نامہ" اور "شادی نامہ" کو غوثی ارکاٹی کی تصانیف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "غوثی کے مرشد کا نام قدرت اللہ تھا" (۵۶)۔ لیکن مذکورہ دونوں نظمیں ۱۸ویں صدی عیسوی کے ایک اور صاحب تصنیف بزرگ فی الحال شاہ کرنولی کی ہیں۔ان نظموں میں فی الحال شاہ نے واضح الفاظ میں اپنے والد اور پیر و مرشد حضرت شاہ قدرت اللہ کا تذکرہ کیا ہے۔ لہذا "چکی نامہ" اور "شادی نامہ" (۵۷) کو فی الحال شاہ کی تصانیف قرار دینے میں کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

غوثی ارکاٹی کو فنِ تاریخ گوئی میں خاص کمال حاصل تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی کم و بیش تمام تصانیف کی تاریخ تصنیف نکالی ہے بلکہ اپنے احباب کی تصانیف پر بھی تاریخی نظمیں لکھی ہیں۔یہاں "خمسہ۔ متحیرہ اوج آگاہی" مصنفہ محمد باقر آگاہ کی ایک مثنوی "حسرت عشق" کی تعریف میں غوثی کا لکھا ہوا ایک قصیدہ نموناً پیش کیا جاتا ہے۔ "خمسہ۔ متحیرہ" آگاہ کی غیر مطبوعہ تصنیف ہے اور غوثی کا زیر نظر قصیدہ بھی ہنوز زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوا۔ اس قصیدے میں غوثی نے باقر آگاہ کے کمالِ فن کی تعریف کرتے ہوئے، ان کی مثنوی "حسرت عشق" کا مقابلہ نہ صرف دکن کے بلند پایہ شعرا ملک الشعراء نصرتی، ابن نشاطی اور محمود بحری کی مثنویوں "گلشن عشق"، "پھول بن" اور "من لگن" سے کیا ہے بلکہ میر تقی میر اور سودا کی مثنویوں سے بھی کیا ہے۔

قصیدہ در تعریف "حسرت عشق" از سید محمد غوث غوثی:

اے آگہہ طبع کے تیرے چمن سے ۔۔۔ بہار اڈی ہے جوں تارے گگن سے

گلِ گل زار حسرت نامہ تیرا ۔۔۔ لیا گیا رنگ و بو بوے یمن سے

ہے ہراک صفحہ جوں خورشید تاباں ۔۔۔ سطور اس کے مشابہہ ہیں کرن سے

بہ دریائے ورق کشتی بتی ۔۔۔ چلی تجہ فکر کی قادر پٹن سے

نہ کیوں خم ہو ہلال آسا سفینہ ۔۔۔ بھرے ہیں اس میں مضموں نورتن سے

سواد اس کا ہے جوں زلف دلآویز
ہے کیا نسبت اسے مشکِ ختن سے
نقاط اس کے ہیں ایسے ہر ورق پر
نظر جوں آویں شبنم پھول بن سے
نہیں سرخی مگر عکسِ مئے سرخ
کسی کی چشم مستانہ کدن سے
جو دیکھیں آب و تاب اس کا جواہر
نہ نکلیں قعر دریا کے وطن سے
سنے یہ نظم گر معشوق و عاشق
ہوں اپنی قبر میں رقصاں کفن سے
کہ اس نسخے کے تئیں بحری نے پڑیا
اٹھا دیتا من اپنا "من لگن" سے
ڈوباتا نصرتی "گلشن" کو اپنے
بہاکر اشک کے نالے نین سے
گر اس مضموں کی موجیں دیکھے سودا
ملا دے مثنوی اپنی چمن سے
اگر "دریائے عشق اس جوش کوں پائے
تو چھوٹے کھاری ہو چینا پٹن سے

نشاطی دیکھتا گر یہ "فرح باغ"
تو دھوتا ہاتھ اپنے "پھول بن" بن سے

۱۱۹۶ھ

حوالے:

مطبوعہ "سب رس" حیدرآباد۔ اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

(۱) نصیر الدین ہاشمی۔ مدراس میں اردو ص ۳۲۔(۲)
(۲) نصیر الدین ہاشمی۔ کتب خانہ۔ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ص ۷۸۹۔
(۳) نصیر الدین ہاشمی۔ کتب خانہ۔ آصفیہ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست (جلد ۱) ص ۲۱۶۔
(۴) ڈاکٹر جمیل جالبی نے "تاریخ ادب اردو" کی پہلی جلد میں غوثی کو بیجاپوری الاصل بتایا ہے۔ دیکھیے کتاب مذکور ص ۴۷۳۔
(۵) ڈاکٹر زور۔ تذکرۂ اردو مخطوطات۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو (جلد ۱) ص ۴۹۔
(۶) افضل الدین اقبال۔ مدراس میں اردو ص ۱۷۲۔
(۷) کاوش بدری۔ ارکاٹ کے قدیم ادبا و شعرا۔ مشمولہ ارکاٹ اور دیگر مقامات کا۔ ادبی سرمایہ۔ مرتبہ ڈاکٹر جلال عرفان۔ ۱۹۸۶ء۔ سلسلہ۔ اشاعت نمبر ۵۔ وانم باڑی ص ۸۴۔
(۸) نصیر الدین ہاشمی، کتب خانہ۔ آصفیہ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست ص ۱۵۸ (مخطوطہ نمبر ۲۷۳)۔
(۹) سید ظہیر الدین مدنی۔ سخنوران گجرات۔ ترقی اردو بیورو دہلی ص ۲۵۴۔
(۱۰) یادگار الشعرا۔ اسپرنگر (ترجمہ طفیل احمد) اترپردیش اردو اکیڈمی لکھنو ۱۹۸۵ء ص ۱۲۸۔

(۱۱) ڈاکٹر آمنہ خاتون - "شہادت جنگ سلطانی کی اشاعت کے اسباب" مشمولہ سال نامہ "مخزن" (مہاراجہ کالج میسور بابت ۱۹۵۸ء) ص ۵۴-

(۱۲) ایضاً ص ۵۳-

(۱۳) عبد القادر ناظر-بہار اعظم جاہی مطبوعہ مدراس ۱۹۶۱ء ص ۱۶۷-

(۱۴) ڈاکٹر آمنہ خاتون -شہادت جنگ سلطانی کی اشاعت کے اسباب "مخزن" ص ۵۳-

(۱۵) ایضاً ص ۵۸، (۱۶) ایضاً- (۱۷) ایضاً-

(۱۸) ایضاً- (۱۹) ایضاً ص ۵۹-

(۲۰)-

(۲۱) باقر آگاہ- "خمسہ- متحیرہ اوج آگاہی" (قلمی) کتب خانہ سالار جنگ مخطوطہ نمبر ۳۰۷-

(۲۲) غوثی ارکاٹی- قصص الانبیا بہ حوالہ دکھنی کے چند تحقیقی مضامین (نصیر الدین ہاشمی) ص ۶۳-

(۲۳) غوثی، قصص الانبیا (قلمی) کتب خانہ سالار جنگ (حیدر آباد) مخطوطہ نمبر ۱۱۰-

(۲۴) ایضاً-

(۲۵) اکبر الدین صدیقی و محمد علی اثر-تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو (جلد ۶) ص ص ۲۴۸-۲۴۹

(۲۶) افصحی بیجاپوری-وفات نامہ- مخطوطہ نمبر ۴۴ کتب خانہ- سالار جنگ (حیدر آباد)-

(۲۷) ایضاً ص ۲۰-

(۲۸) افصحی کا ۲۱ اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ کتب خانہ- سالار جنگ (مخطوطہ نمبر ۳ بیاض مراثی) میں محفوظ ہے- جس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے-

دو گل علی نبی کے پریشاں نکل چلے زخمی دلاں سوں مرہم ریشاں نکل چلے

ماتم سوں افصحی کے نین شمع ہو جلے کیوں نا جلے جو شمع دل و جاں نکل چلے

(۲۹) افسر صدیقی امروہی- مخطوطات انجمن ترقی اردو (کراچی) (جلد اول) ص ۴۷-

(۳۰) غوثی ارکاٹی -ریاض غوثیہ (قلمی) کتب خانہ- سالار جنگ (حیدر آباد) مخطوطہ نمبر ۲۲۷-

(۳۱) غوثی ارکاٹی-غوثیہ -کتب خانہ- ادارۂ ادبیات اردو (مخطوطہ نمبر ۳۹۷) ورق ۸۲- (۳۲) ایضاً-

(۳۳) "قصص الانبیا" بہ حوالہ دکھنی کے چند تحقیقی مضامین (نصیر الدین ہاشمی) ص ۶۷-

(۳۴) غوثی ارکاٹی-غوثیہ (قلمی) مخطوطہ نمبر ۳۹۷ ادارۂ ادبیات اردو ورق ۸۱ ب-

(۳۵) ایضاً "قصص الانبیا" (قلمی) ادارۂ ادبیات اردو مخطوطہ نمبر ۹۱۲ ورق ۲۴۶-

(۳۶) نصیر الدین ہاشمی نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ مدراس کے کسی معلی نامی شاعر نے غوثی کی تاریخ وفات بھی نکالی تھی- دیکھیے دکنی کے چند تحقیقی مضامین ص ۶۲-

(۳۷) بہار اعظم جاہی مؤلفہ غلام عبد القادر ناظر مطبوعہ مدراس ۱۹۶۱ء- ص ۱۶۶-

(۳۸) "مدراس میں اردو" کے مؤلف نے غوثی کی تصانیف میں "ریاض غوثیہ" کا تذکرہ نہیں کیا۔
(۳۹) غوثی - ریاض غوثیہ (قلمی) کتب خانہ۔ سالار جنگ مخطوطہ نمبر ص ۱۸۔
(۴۰) ایضاً ص ۱۹۔ (۴۱) ایضاً ص ۲۳۷۔
(۴۲) مولوی سخاوت مرزا - ریاض غوثیہ - نوائے ادب - بمبئی - اپریل ۱۹۶۷ء ص ۱۷۔
(۴۳) نصیر الدین ہاشمی - وضاحتی فہرست مخطوطات کتب خانہ۔ آصفیہ جلد اول) ص ۲۱۶۔
(۴۴) غوثی - قصص الانبیا (قلمی) مخطوطہ نمبر ۲۵ ادارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد)۔
(۴۵) ایضاً ریاض غوثیہ (قلمی) کتب خانہ سالار جنگ مخطوطہ نمبر ۲۲۷ ص ۲۳۷۔
(۴۶) ایضاً۔۔
(۴۷) غوثی ارکاٹی - غوثیہ (قلمی) بہ حوالہ مخطوطات انجمن مرتبہ افسر صدیقی (جلد پنجم) ص ۱۸۹۔
(۴۸) ایضاً صفحہ ۱۸۹۔
(۴۹) غوثی - غوثیہ (قلمی) مخطوطہ د نمبر د ۳۹۷ ورق ۸۱ / ب۔
(۵۰) ڈاکٹر زور - تذکرۂ مخطوطات - ادارۂ ادبیات اردو (جلد ا مخزونہ کتب خانہ۔ ادارۂ ادبیات اردو - حیدر آباد۔
(۵۳) افسر صدیقی - مخطوطات انجمن ترقی اردو (کراچی) - (جلد اول) ص ۴۰۵۔
(۵۴) مخطوطہ نمبر تفسیر ۱۴۵۔
(۵۵) نصیر الدین ہاشمی - وضاحتی فہرست مخطوطات کتب خانہ۔ آصفیہ (جلد دوم ص ۳۸۔ (۵۶) ایضاً ص ص ۳۰۲ و ۳۰۳۔
(۵۷) مرتبین مخطوطات انجمن ترقی اردو (کراچی) (جلد اول) نے بھی نصیر الدین ہاشمی کی تقلید میں انھیں کے حوالے سے مذکورہ دونوں نظموں کو غوثی کی تصانیف میں شمار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فہرست مذکور ص ۷۷۔

مطبوعہ "مجلہ عثمانیہ" ۔ کراچی ۔ جنوری ۱۹۹۶ء

○ ○ ○

مولانا باقر آگاہ ویلوری

جدید تحقیق کی روشنی میں

عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین نے صحت مند خطوط پر، دکنی شعر و ادب کا پہیہ اس قدر تیز رفتاری سے گھمایا تھا کہ ان سلطنتوں کے زوال کے بعد بھی، صدیوں تک اس کی رفتار روکی نہ جا سکی اور وقتاً فوقتاً سرزمین دکن بلند پایہ شاعر اور ادیب پیدا کرتی رہی۔ محمد باقر آگاہ ویلوری (۱۱۵۸ھ - ۱۲۲۰ھ) دکنی شعر و ادب کی انھیں روایات اور رجحانات کے آخری علمبردار، بلند پایہ شاعر، باکمال نثرنگار اور اردو کے اولین نقاد بھی تھے۔ وہ نہ صرف عربی، فارسی اور دکنی اردو کے صاحبِ دیوان شاعر تھے بلکہ سنسکرت، برج بھاشا اور تلگو زبان پر بھی ماہرانہ عبور رکھتے تھے (۱) عربی، فارسی اور اردو میں ان کی تصانیف کی تعداد ۳۰۳ بتائی جاتی ہے (۲)۔

باقر آگاہ کے والد محمد مرتضیٰ بیجاپور کے متوطن تھے۔ بیجاپور کے زوال کے بعد ترکِ وطن کر کے انھوں نے ویلور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آگاہ ویلور ہی میں تولد ہوئے۔ وہ اپنے وقت کے مشہور صوفی بزرگ اور صاحبِ دیوان شاعر شاہ ابوالحسن قربی ویلوری (۱۱۰۷ھ -۱۱۸۲ھ) کے مرید، شاگرد اور تربیت یافتہ تھے۔ یہ انھیں کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ آگاہ پندرہ سال کی عمر ہی سے شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے۔ سترہ سال کی عمر میں انھوں نے حضرت قربی کی مدح میں ایک قصیدہ تحریر کیا تھا، جسے دیکھنے کے بعد استاد نے اپنے ہونہار شاگرد کے لیے دعائے خیر مانگی اور کچھ ہی عرصے میں، ایک متبحر عالم دین اور باکمال شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

نواب والاجاہ والیِ "کرناٹک" ان کے علم و فضل کے ایسے قدردان ہوئے کہ

انھیں اپنے فرزندوں امیر الامراء اور عمدۃ الامراء کا اتالیق مقرر کیا اور پھر انھیں معتمد خاص کے عہدے پر بھی مامور کیا (۳) ۔ مولانا آگاہ، میر اور سودا کے ہم عصر تھے اور اپنے معاصر مصنفین میں ان کو ایک نمایاں اور غیر معمولی اہمیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی حسب ذیل آٹھ منظوم کتابوں کو نثری دیباچوں سے آراستہ کیا ہے۔

۱۔ ہشت بہشت (۱۱۸۵ھ ۔ ۱۲۰۶ھ) ۲۔ ریاض الجناں (۱۲۰۷ھ) ۳۔ فوائد در فوائد (۱۲۱۰ھ) ۵۔ تحفتہ الاحباب (۱۲۰۷ھ) ۶۔ گلزار عشق (۱۲۱۰ھ) ۷۔ خمسہ۔ متحیرہٗ اوج آگاہی (۱۲۱۳ھ ۔ ۱۲۱۴ھ) ۸۔ دیوان آگاہ (قبل ۱۲۲۰ھ)

موجودہ تحقیق کی روشنی میں مذکورہ کتابوں کے علاوہ باقر آگاہ کی مزید ۱۴ تصانیف کا پتہ چلتا ہے:

رسالہ، عقائد (۱۱۸۵ھ) ۔ تحفتہ النساء (۱۱۸۵ھ) ۔ حاشیہ من در پن (۱۲۰۶ھ ۔ ۱۲۲۰ھ) ۔ روضتہ الاسلام (۱۲۱۴ھ) ۔ وفات نامہ ۔ مراثی آگاہ (قبل ۱۲۲۰ھ) ۔ ابیات ستہ ۔ روپ سنگار (۱۲۱۵ھ) ۔ مناجات آگاہ ۔ ہدایت نامہ ۔ رسالہ، فقہ ۔ فرقہ ہائے اسلام ۔ ریاض السیر ۔ معراج نامہ ۔

نواب صدیق حسین خاں نے اپنے تذکرے "شمع انجمن" میں لکھا ہے کہ "کرناٹک میں ان کے ایسا کوئی سربلند نہ ہوا اور مدراس میں ان کا کوئی عدیل نہیں، صاحب تصانیف کثیرہ تھے ۔ اور بہت سے کمالات کے حامل تھے (۴) ۔

"تذکرہٗ صبح وطن" کے مؤلف کا بیان ہے کہ "تمام فنون میں عربی، فارسی اور ہندی (اردو) کی پچاس ہزار چھ سو ابیات ان کی کثرت تصانیف کی گواہ ہیں ۔ اس علاقے (مدراس) کے بہت سے لوگ ان کے فیض سے مرتبہ، فضل و کمال کو پہنچے (۵) ۔

مولانا مہدی واصف اپنے تذکرے "حدیقتہ المرام" میں رقم طراز ہیں کہ "اللہ نے آپ کو شرح صدر سے مشرف فرمایا اور علوم کے دروازے آپ پر کھول دیے ۔۔۔۔ آپ بڑے ذہین تھے جس کی نظیر نہیں ۔ قاموس آپ کو حفظ تھی ۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء عصر کو آپ پر رشک و حسد ہوتا تھا ۔ آپ کی معلومات اور عربی و فارسی

طرزِ تحریر آپ کے کمال پر دال ہے (۶)۔

مؤلف "تذکرۂ نتائج الافکار" کا بیان ہے کہ "گلشن کرناٹک میں ان جیسا سرو پیدا نہیں ہوا اور گلستان مدراس میں ان کے مقابلے کا رنگ افروز گل نہیں کھلا (۷)۔

متذکرۂ بالا تذکرہ نگار کے بیانات کے پیش نظر، بعد ازاں مولوی نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر یوسف کوکن، پروفیسر سروری، ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے مولانا آگاہ کی حیات اور کارناموں کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو باقر آگاہ کی اردو تصانیف کی تعداد کا ہی تعین ہو سکا ہے اور نہ ان کے صحیح ناموں کا علم۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جدید تحقیق کی روشنی میں، مولانا آگاہ کی اب تک معلوم تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو تصانیف کے صحیح نام اور سنہ تصنیف کے علاوہ دیگر ضروری معلومات بھی یک جا کر دی جائیں تاکہ آئندہ تحقیق کرنے والوں کو کسی الجھن اور مغالطے سے دوچار ہونا نہ پڑے۔

مطبوعہ تصانیف:

رسالہ عقائد (سنہ تصنیف ۱۱۸۵ھ) ۱۵۰۰/ ابیات پر مشتمل اس مثنوی کا موضوع عقائد اہلِ سنت ہے۔ درج ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ باقر آگاہ کی پہلی تصنیف ہے

کہا میں نتیں کبھی دکنی میں اشعار   مجھے ہے شعر کہنے سوں بہت عار (۸)

اس تصنیف کا نام خود مصنف نے "مثنوی ہشت بہشت" کے دیباچے میں "رسالہ عقائد" بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب ۱۱۸۵ھ کی تصنیف ہے (۹) لیکن مختلف کتابوں میں اس کے نام اور سنہ تصنیف کا غلط اندراج ملتا ہے۔ جیسے:

"عقائد اہل سنت" (سنہ تصنیف قریب ۱۲۵۰ھ) (۱۰) عقائد آگاہ (تصنیف ۱۲۰۰ھ)

"فرائد در عقائد" (سنہ تصنیف ۱۲۰۰ھ) (۱۲) "فرائد در بیان فرائد" وغیرہ (۱۳)

"رسالہ عقائد" کے دو قلمی نسخے کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو۔ حیدرآباد میں (۱۴) پانچ کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ دہلی میں (۱۵) اور ایک ایک نسخہ اورینٹل

ینو سکرپٹ لائبریری ۔ حیدر آباد (۱۶) کتب خانہ ۔ سالار جنگ (۱۷) کتب خانہ ۔ رحمانیہ مدراس (۱۸) نیشنل لائبریری ۔ پیرس (۱۹) ۔ کتب خانہ ۔ سعیدیہ حیدر آباد (۲۰) امانتی کتب خانہ ۔ مدراس (۲۱) اور کتب خانہ ۔ انجمن ترقی اردو ۔ کراچی (۲۲) میں محفوظ ہے ۔

۲۔ تحفتہ النساء (سنہ تصنیف ۱۱۸۵ھ) آٹھ سو ابیات پر مشتمل اس مثنوی میں حسب ذیل بنات الطاہرات اور امہات المومنین کے اوصاف و مناقب بیان کیے گئے ہیں:

حضرت فاطمہ زہرا، زینب، رقیہ، ام کلثوم، خدیجہ، عائشہ، حفصہ، زینب بنت خزیمہ، رابعہ بصریہ، معاذہ، شعرانہ، فاطمہ خراسانیہ، ام علی، ام محمد، رابعہ، حکیمہ ۔

مصنف نے درج ذیل اشعار میں اس کے سنہ تصنیف اور تعداد اشعار کی وضاحت کی ہے:

ہیں آٹھ سو اس کے جملہ ابیات   پڑھنے میں ہے اس کے بھوت برکات
اگیارہ سو اوپر تھے پنج و ہشتاد   ہجرت سے بنا ہے تب یہ رکھ دیا (۲۳)

"تحفتہ النساء" کے ۸ قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے ۔ جن میں سے ایک کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو ۔ میں (۲۴) ۲ کتب خانہ ۔ آصفیہ میں (۲۵) ایک کتب خانہ ۔ رحمانیہ مدراس میں (۲۶) ایک قومی عجائب گھر ۔ کراچی میں (۲۷) ایک کتب خانہ ۔ انجمن ترقی اردو کراچی میں (۲۸) اور ایک کتب خانہ ۔ سعیدیہ حیدر آباد میں (۲۹) محفوظ ہے ۔

۳۔ ہشت بہشت (سنہ تصنیف ۱۱۸۵ھ تا ۱۲۰۶ھ) یہ کتاب دراصل سیرت نبی کے موضوع پر درج ذیل آٹھ منظوم رسائل کا مجموعہ ہے: آگاہ نے اس مثنوی کے دیباچے میں جملہ ابیات کی تعداد آٹھ ہزار چھ سو پچاس بتائی ہے (ص ۹) ۔

۱۔ من دیپک (۱۱۸۵ھ) ۲۔ من ہرن (۱۱۸۵ھ) ۳۔ من موہن (۱۱۹۶ھ) ۴۔ جگ سوہن (۱۱۸۵ھ) ۵۔ آرام دل (۱۱۸۵ھ) ۶۔ راحت جاں (۱۱۸۶ھ) ۷۔ من درپن (۱۲۰۶ھ (۳۰) ۸۔ من جیون (۱۲۰۶ھ) (۳۱) ۔

آگاہ نے "ہشت بہشت" کے ابتدائی چھ رسالے ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۶ھ کے درمیان نواب محمد امیر الامرا بہادر کی فرمائش پر مکمل کر لیے تھے ۔ لیکن دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس کی تصنیف کا کام طوالت میں پڑ گیا ۔ یہاں تک کہ ۱۲۰۳ھ میں ان کے

"رفیق باتوفیق" (امیر الامرا) نے وفات پائی اور باقر آگاہ کا دل سرد ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد دوست احباب کی توجہ دہانی اور اصرار پر ۱۲۰۶ھ میں آخر کے دو رسائل کی بھی تکمیل عمل میں آئی۔ ہشت بہشت کے آٹھ مخطوطات کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں سے دو کتب خانہ۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی میں (۳۱) اور ایک ایک ادارۂ ادبیات اردو (۳۲) کتب خانہ۔ رحمانیہ۔ مدراس (۳۳) کتب خانہ۔ جامعہ عثمانیہ (۳۴) کتب خانہ۔ سالار جنگ (۳۵) برٹش میوزیم۔ لندن (۳۶) اور کتب خانہ۔ سعیدیہ حیدر آباد میں (۳۷) محفوظ ہے۔ یہ کتاب بمبئی اور مدراس سے کئی بار چھپ چکی ہے۔ ذخیرۂ شمس اللہ قادری ادارۂ ادبیات اردو میں ۱۳۱۹ھ کا مطبوعہ نسخہ (مطبع گلزار حسینی بمبئی) موجود ہے (کتاب نمبر ۸۱۳)

۴۔ حاشیہ من درپن (سنہ تصنیف درمیان ۱۲۰۶ھ) من درپن "ہشت بہشت کا ساتواں اور تین ہزار ایک سو اکسٹھ اشعار پر مشتمل ضخیم ترین رسالہ ہونے کے باوجود مصنف کی نظر میں مختصر تھا اس لیے اس نے اس پر ۲۵۰/ ابیات کا ایک حاشیہ تحریر کرنا ضروری سمجھا۔ اس حاشیے میں "اعجاز القرآن" کو موضوع بنایا گیا ہے۔ چنانچہ خود مصنف کا بیان ہے کہ:

پس از حمد خدا و نعت مختار سن اس مضموں کوں گوش دل سے اے یار

کہ من درپن میں بولا میں یہ ایجاز بائیں ہیں قراں کا اعجاز (؟)

جب اس کو مختصر تر کردیا ہوں کئی جا میں اشارت کر گیا ہوں

یہ نظم صاف کے تئیں اب کہا میں بطور حاشیہ اس پر لکھا میں (۳۸)

۵۔ محبوب القلوب (۱۲۰۶ھ) چار ہزار ترسٹھ ابیات پر مشتمل اس مثنوی میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے مستند حالات و کوائف بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں آگاہ نے محبوب سبحانی کی مدح میں ۵۵، ۵۵ شعر کے دو قصیدے بھی شامل کیے ہیں۔ اگر مثنوی کے اشعار میں قصیدوں کے شعر بھی شامل کر لیے جائیں تو جملہ ابیات کی تعداد ۴۱۷۳ ہو جاتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں محبوب القلوب کا سنہ تصنیف اور ابیات کی تعداد بتائی گئی ہے:

تھا ششم سال بارا سو اپر جب　　بحال خوش ہوا ہے یہ مرتب
تمام ابیات اس کے اے مساعد　　ہوئے چار الف و ترسٹھ بے قصائد

اس مثنوی کو آگاہ نے مختلف ابواب اور ذیلی ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہرباب کو " وصل " اور ہر ذیلی باب کو " جلوہ " کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کے نثری دیباچے میں مصنف نے اپنے ماخذ کے علاوہ کتاب کی ترتیب اور نقطہ نظر کی بھی وضاحت کی ہے۔ یہ کتاب مطبع فردوسی مدراس سے ۱۳۰۷ھ میں چھپ چکی ہے۔ اس کا ایک نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے ذخیرہ شمس اللہ قادری (کتاب نمبر ۸۱۵) میں محفوظ ہے۔ محبوب القلوب کے ۴ مخطوطے ادارۂ ادبیات اردو میں (۳۹) ۲ نسخے انجمن ترقی اردو کراچی میں (۴۰) اور ایک ایک نسخہ کتب خانہ رحمانیہ مدراس، (۴۱) امانتی کتب خانہ مدراس (۴۲) اور قاضی عبیداللہ اورینٹل لائبریری مدراس (۴۳) میں موجود ہے۔

۶۔ ریاض الجناں (۱۲۰۷ھ) اس مثنوی میں اہل بیت کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں۔ مقدمہ سے قبل آگاہ نے حمد و نعت و منقبت اہل بیت و منقبت خلفاء راشدین و منقبت غوث اعظم اور سبب تالیف کے عناوین قائم کیے ہیں۔ سنہ تصنیف اور اشعار کی تعداد درج ذیل اشعار میں ظاہر کی گئی ہے:

جب تھے بارا سو اور سات برس　　تب بنا ہے یہ نسخہ اقدس
ہیں گی ابیات اس کی تین ہزار　　اور نود پہ نو بلا تکرار

یہ مثنوی مطبع رحمانیہ۔ حیدرآباد سے ۱۲۸۵ھ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا ایک نسخہ ذخیرۂ شمس اللہ قادری ادارۂ ادبیات اردو۔ میں موجود ہے (نمبر ۸۱۶) مختلف کتب خانوں میں " ریاض الجناں " کے ۱۵ قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں سے ۴ ادارۂ ادبیات اردو (۴۴)۔ ۳ کتب خانہ رحمانیہ۔ مدراس (۴۵) ۲۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی (۴۶) اور ایک ایک نسخہ امانتی کتب خانہ۔ مدراس (۴۷) کتب خانہ سالار جنگ (۴۸) کتب خانہ آصفیہ (۴۹) برٹش میوزیم (۵۰) نیشنل ببلیوتک۔ پیرس (۵۱) کتب خانہ جامعہ عثمانیہ (۵۲) قومی عجائب گھر کراچی (۵۳) اور رضا لائبریری۔ رام پور کا مخزونہ ہے (۴۵)۔

۷۔ تحفتہ الاحباب (۱۲۰۷ھ) اس کتاب میں اصحاب رسول کے مناقب

تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مثنوی تین ہزار چار سو چھبیس اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا سنہ تصنیف (۱۲۰۷ھ) درج ذیل اشعار میں ظاہر کیا گیا ہے:

در سن یک الف و دو صد اور سات — فضل حق سے ختم پایا خوب دھات
ہیں گے سب ابیات اس کے بے گمان — سہ ہزار و چار سو چھبیس جان

۸۔ فرائد در فوائد (۱۲۱۰ھ) مختلف کتابوں میں اس مثنوی کے دوسرے نام "فرائد در عقائد" (۵۵) اور فوائد در قواعد" (۵۶) بھی ملتے ہیں اس کا صحیح نام "فرائد در فوائد" ہے (۵۷) جیسا کہ خود باقر آگاہ نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے:

"اس رسالے کا نام" فرائد در فوائد" ہے ہر فائدہ اس کا دردانہ بے مول اور خراج ملک معنی کا ہم تول ہے ہندی زبان میں ہے کر کر اسے سرسری نہ جان۔"

پوری کتاب میں آگاہ نے ستائیس فوائد کی تفصیل بیان کی ہے۔ جن میں سے ابتدائی اٹھارہ فوائد وحی و قران کے بارے میں ہیں اور باقی فائدوں میں احادیث رسول کی منزلت، نیکیوں کی توصیف وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ یہ مثنوی ایک ہزار پانچ سو دس ابیات پر پھیلی ہوئی ہے اور ۱۲۱۰ھ ماہ رمضان میں تصنیف کی گئی۔ جیسا کہ درج ذیل اشعار میں خود مصنف نے اس جانب اشارہ کیا ہے:

تمام ابیات اس کے جو ہیں سب رس — یک ہزار و پان صد و دس
تھے بارا سو پہ جب دس اے گرامی — بہ شہر صوم پایا ہے تمامی

۹۔ روضتہ الاسلام (۱۲۱۴ھ) بعض محققین نے اس مثنوی کا نام "روضتہ السلام" لکھا ہے (۵۸)۔ جب کہ خود مصنف نے اس کا نام "روضتہ الاسلام" بتایا ہے:

نام اس کا ہے روضتہ الاسلام — دیوے حق سب کو اس سے نفع تمام

۲۴۲۴/ ابیات (۵۹) پر مشتمل اس مثنوی کا موضوع شافعی فقہ ہے۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے اپنی کتاب "مدارس میں اردو ادب کی نشو و نما" میں "روضتہ الاسلام کی تاریخ تصنیف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے" یہ مثنوی ۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹ء میں تصنیف ہوئی۔ "محمدی مذہب" اور "روضہ۔ دلنواز" سے اس کی تاریخیں نکلتی ہیں (۶۰)۔

ڈاکٹر اقبال کے متذکرہ مادہ ہائے تاریخ اس لیے صحت پر مبنی نہیں ہیں کہ اول

الذکر سے ۸۹۴ اور آخرالذکر سے ۱۱۰۹ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ "روضتہ الاسلام" کے آخر میں خود مصنف نے تین قطعات تاریخ لکھے ہیں، جن کی آخری ابیات یہ ہیں:

کہا سال اتمام ناگہ سروش کہ " ہے یہ عجب روضہ دلنواز "

ناگہاں ازسر امداد سروش بول اٹھا ، روضہ دین و اسلام

کہا ناگاہ ہاتف ازسرجد ہے یہ بیشک محمدی مذہب

اول الذکر شعر میں " ہے یہ عجب روضہ دلنواز " سے تاریخ برآمد ہوتی ہے جب کہ اخرالذکر دونوں اشعار میں تعمیہ ہے یعنی " روضہ دین و اسلام " کے اعداد میں " سر امداد یعنی الف (ا) کے اعداد جمع کیے جائیں۔ اسی طرح آخرالذکر شعر کے دوسرے مصرع کے اعداد میں " سرجد " یعنی ج (۴) کے اعداد شامل کیے جائیں تو صحیح تاریخ تصنیف برآمد ہوتی ہے۔

۱۰۔ رسالہ فقہ (قبل ۱۲۰۰ھ) دو سو چھیاسٹھ اشعار پر مشتمل اس مثنوی میں فقہ کے مسائل نظم کیے گئے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ باقر آگاہ کے تمام تذکرہ نگار اور محققین نے جن میں نصیر الدین ہاشمی بھی شامل ہیں آگاہ کی اردو تصانیف میں " رسالہ فقہ " کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حالاں کہ خود نصیر الدین ہاشمی نے فہرست مخطوطات سالار جنگ کے صفحہ ۸۱ پر اس مخطوطے کا تذکرہ کرتے ہوئے اطلاع دی ہے کہ " یہ کتاب طبع ہو چکی ہے مگر نایاب ہے۔"

غیر مطبوعہ تصانیف:

۱۔ گلزارِ عشق (۱۲۱۰ھ) پروفیسر سروری نے آگاہ کی چودہ تصانیف کا تذکرہ کرتے ہوئے آٹھویں نمبر پر " گلزار عشق اور نویں اور دسویں نمبر پر علی الترتیب " قصہ رضوان شاہ اور روح افزا " کے نام تحریر کیے ہیں۔ حالاں کہ " گلزار عشق " ہی میں آگاہ نے " قصہ رضوان شاہ اور روح افزا " کو موضوع سخن بنایا ہے۔ یہ دراصل آگاہ کی تصنیف کی ہوئی ایک ہی مثنوی ہے۔ جس کے سروری صاحب نے تین نام بتائے ہیں۔

" گلزارِ عشق " کے درج ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ آگاہ نے اس کا آغاز ۱۱۹۱

میں کیا تھا اور تکمیل ۱۲۱۰ھ میں ہوئی۔ گویا یہ مثنوی ۱۹ سال کے عرصے میں پایہ تکمیل کو پہنچی:

تھے جب یک ہزار اور نو کم دو سو بنا اس کا دیباجہ اے گرم رو
گزر گئے ہیں جب اس پر انیس سال ہوا بدر کامل یہ زیبا ہلال (۶۱)

"گلزار عشق" کے جملہ ابیات کی تعداد ۳۵۹۰/ بتائی گئی ہے

کیا اس کے بیتوں کو جب میں عدد ہوئے ۔۔ ہزار اور پان سو نود

"گلزار عشق" ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس کے چار قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد کی زینت ہے (۶۲)۔ اور ایک کتب خانہ آکسفورڈ میں محفوظ ہے (۶۳) اور اس مثنوی کے دو مخطوطے کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ کراچی کے مخزونہ ہیں (۶۴)۔ "گلزار عشق" کا ایک ناقص الاخر نسخہ قاضی عبید اللہ لائبریری (مدراس) میں بھی موجود ہے۔ (فہرست مخطوطات، ص ۱۳۱ مخطوطہ نمبر ۴۲) اس مثنوی کے نثری دیباچے میں آگاہ نے جہاں دکنی کے شعرا یعنی نشاطی، فراقی، شوقی، خوشنود، غواصی، ذوقی۔ ہاشمی۔ شغلی۔ بحری۔ نصرتی اور مہتاب کے شاعرانہ کمال کی داد دی ہے۔ وہیں شمالی ہند کے سخن وروں سودا، درد، مظہر، فغاں، دردمند یقین، آبرو، آرزو اور تاباں کی شعری صلاحیتوں کو سراہا بھی ہے۔ "گلزار عشق" کے دیباچے میں آگاہ نے دکنی شعراء کی تصانیف کو اس لیے بلند مرتبہ اور نصرتی کو سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے کہ "شمالی ہند کے شاعروں میں سے کوئی بھی مثنوی معتدبہ نہیں کہا۔ فقط غزلیات، قصائد اور قطعات پر اکتفا کیا اس عصر میں حسن دہلوی ایک مثنوی مختصر لکھا۔ برخلاف شعراء دکن کے کہ اکثر مثنویات کہے ہیں۔ بالاتفاق غزل بولنا آسان اور مثنوی کہنا دشوار اور گراں ہے (باقر آگاہ کے ادبی نوادر۔ از سلیم صبا نویدی ص ۱۴۴)۔

۲۔ خمسہ متحیرہ اوج آگاہی (۱۲۱۳ھ تا ۱۲۱۴ھ) یہ کتاب دراصل آگاہ کی پانچ مثنویوں ۱) "صبح نو بہار عشق" ۲) ندرت عشق ۳) غرقاب عشق ۴) حیرت عشق اور ۵) "حسرت عشق" کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر سروری (۶۵)، ڈاکٹر زور (۶۶) اور نصیر الدین ہاشمی (۶۷) نے اس کتاب کا نام "خمسہ متحیرہ" لکھا ہے جب کہ یوسف کوثری صاحب نے "خمسہ متحیرہ" (۶۸) تحریر کیا ہے۔ راقم الحروف نے جب اس سلسلے میں قلمی

نسخوں کی چھان بین کی تو پتہ چلا کہ آخر الذکر محقق کا دیا ہوا نام " خمسہ متحیرہ ہی درست ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے آگاہ کی اردو تصانیف کی فہرست میں پیش نظر کتاب کا تذکرہ کیے بغیر اس مجموعے کی ابتدائی دو مثنویوں " صبح نوبہار عشق " اور ندرت عشق " کی نشان دہی کی ہے۔ پروفیسر یوسف کوکن نے " خمسہ متحیرہ اوج آگاہی " کے بارے میں لکھا ہے کہ " اب تک اس کے کسی نسخے کا کہیں پتہ نہ چلا۔ " گلدستہ کرناٹک " میں اس کا نام دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے کل ابیات کی تعداد " ۴۵۰۰ ہے (۶۹)۔

" خمسہ متحیرہ اوج آگاہی " کا ایک نسخہ کتب خانہ، لطیفیہ حضرت مکان " ویلور میں راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ کتاب کی جلد کے اوپر کسی نے مصنف کا نام " غوثی آرکاٹی " تحریر کیا ہے۔ یہ سہو غالباً اس لیے ہوا ہوگا کہ کتاب کے آخر میں غوثی آرکاٹی کا قطعہ تاریخ درج ہے۔ " خمسہ متحیرہ " کا ایک اور نسخہ کتب خانہ، سالار جنگ کی زینت ہے (۷۰)۔ اس کے علاوہ اس کتاب کی اولین مثنوی " صبح نوبہار عشق " کا ایک مخطوطہ کتب خانہ، انجمن ترقی اردو کا مخزونہ ہے (۷۱) اور اس مجموعے کی ابتدائی تین مثنویاں " صبح نوبہار عشق "، " ندرت عشق " اور " غرقاب عشق " ۔ اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری (کتب خانہ، آصفیہ) میں محفوظ ہیں (۷۲)۔

" خمسہ، متحیرہ " کی پانچوں مثنویوں کا موضوع عشق ہے، جس میں تصوف کے رنگ کا اضافہ کیا ہے۔ " خمسہ متحیرہ " کی تمام مثنویوں کے اختتام پر سید محمد غوث غوثی ارکاٹی اور سید عبدالقادر قادری کے قطعات تاریخ موجود ہیں۔ غوثی نے اپنی تاریخی نظم میں ان مثنویوں کو " گلشن عشق " (نصرتی) " پھول بن " (ابن نشاطی) اور " من لگن " (بحری) پر بھی فوقیت دی ہے۔

۳۔ روپ سنگار (۱۲۱۵ ھ) پروفیسر یوسف کوکن، اپنی کتاب " باقر آگاہ " میں " روپ سنگار " کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں " یہ بھی ایک مشہور مثنوی تھی، اس کا نسخہ بھی نایاب ہے۔ صاحب تذکرہ " گلدستہ، کرناٹک " نے اس کا تذکرہ کیا ہے (۷۳)۔ لیکن اس نادر و نایاب مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ، ادارۂ ادبیات اردو میں محفوظ ہے (۷۴)۔

تین سو ستر ابیات پر مشتمل اس مثنوی کا موضوع " نائیکہ بھید " ہے بقول ڈاکٹر

زور" سنسکرت شاعری میں عورتوں کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں اور ان کے جو مختلف جذبات واضح کیے گئے ہیں ان سے مصنف نے اس کتاب میں تفصیل سے بحث کی ہے (۷۵)۔ "درج ذیل اشعار سے اس کا نام" روپ سنگار " اور سنہ تصنیف (۱۲۱۵ھ) پر روشنی پڑتی ہے:

بنا جب حسن کا آئینہ اوتار — رکھا میں نام اس کا روپ سنگار

ہے یہ روپ سنگار وہ آرسی — کہ مونہہ اپنا دیکھے وہاں حسن و عشق

میں جب سال تاریخ چاہا، سروش — کہا میں عجب گل فشاں حسن و عشق

ہے اب ہجرت سے بارا سو پہ پندرا — کہ اعجاز اس کا ہے جیسے کا ویسا

ڈاکٹر ذاکرہ غوث نے اپنی کتاب " باقر آگاہ ویلوری شخصیت اور فن " میں " روپ سنگار " کے موضوع پر قدرے تفصیل سے بحث کی ہے۔

۴۔دیوان ہندی (اردو):

باقر آگاہ نے قصیدوں، غزلوں، قطعات اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ جس کے اب تک چار قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔" دیوان آگاہ کا ایک مخطوطہ کتب خانہ۔ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے (۷۶)۔ایک نسخہ کتب خانہ۔ سالار جنگ کے قلمی نوادرات کی زینت ہے (۷۷) اور اس کے دو قلمی نسخے کتب خانہ۔ مدرسہ محمدی۔مدراس کے مخزونہ ہیں (۷۸)۔

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے قلمی دیوان میں قصیدے، غزلیں، قطعات، رباعیاں، افراد، کبت اور دہرے موجود ہیں۔اور آخر میں ایک رباعی تلگو زبان میں اور ایک فرداردی زبان میں بھی ملتا ہے۔دیوان کے آغاز میں نثری دیباچہ بھی موجود ہے۔

کتب خانہ۔ سالار جنگ کے مخزونہ " دیوان آگاہ " میں نثری دیباچہ اور قصائد شامل نہیں ہیں۔اس نسخے میں ۲۸۰ غزلیں، ۸۴ رباعیات، ۱۱ قطعات کے علاوہ ۴۷ متفرق اشعار، ایک تلگو رباعی، چند کبت اور دہرے اور ایک فرداردی زبان میں بھی ہے۔

جناب علیم صبانویدی نے راقم الحروف کی خواہش پر مدرسہ محمدی مدراس کے

کتب خانے میں محفوظ باقر آگاہ کے دونوں دواوین کے زیراکس ارسال کیے ہیں، جن میں صرف غزلیں، رباعیاں اور متفرق اشعار موجود ہیں۔ ان دونوں دواوین میں قصائد اور نثری دیباچے شامل نہیں ہیں۔ البتہ تمام دواوین میں غزلوں کی تعداد ۲۸۰ ہی ہے (۷۹)۔ باقر آگاہ نے محض منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے غزلیں کہی ہیں۔ ان کی غزلیں ان کے پیش رو، ہم عصر یا زمانہ مابعد کے متغزلین کے مقابلے میں چنداں اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان کی غزلوں میں روایت کی تکرار ملتی ہے لیکن اس صنف کے فروغ میں آگاہ اپنے پیرو مرشد حضرت قربی اور ہم عصر شاہ تراب کے مرتبے کو بھی نہیں پہنچتے۔ البتہ ان کی رباعیاں تاریخ ادب اردو میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں مضامین کا تنوع بھی نظر آتا ہے اور انداز بیان کی تازگی اور تاثر کی فراوانی بھی۔

۵۔ مناجات آگاہ ۔ تیرہ اورق پر مشتمل اس مناجات کا ایک قلمی نسخہ، کتب خانہ رحمانیہ (مدراس) میں محفوظ ہے (۸۰)۔

۶۔ معراج نامہ ۔ ۷۔ ہدایت نامہ ۔ ۸۔ فرقہ ہائے اسلام (اوائل ۱۲۰۰ھ):

یہ تینوں مثنویاں پیرس کے قومی کتب خانے کی زینت ہیں۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات میں ان کا تذکرہ کیا ہے (۸۱)۔

۹۔ وفات نامہ رسول اللہ ۔ آگاہ سے منسوب اس تصنیف کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ اس کا تذکرہ یادگار نمبر بتقریب جشن صد سالہ مدرسہ محمدی باغ دیوان صاحب مدراس میں ملتا ہے (۸۲)۔

۱۰۔ ریاض السیر ۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے آں حضرت کی سیرت سے متعلق اس نثری رسالے کو آگاہ سے منسوب کیا ہے لیکن زبان و بیان سے انشراح نہیں ہوتا کہ یہ رسالہ باقر آگاہ کی تصنیف ہے۔

۱۱۔ مراثی آگاہ ۔ چھ اوراق پر مشتمل یہ مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو کی زینت ہے (۸۳)۔ اس نسخے میں آگاہ کے تین سلام اور دو طویل مرثیے شامل ہیں۔

ڈاکٹر زور نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ نسخہ دراصل "ریاض الجنان" (دیکھو مخطوطہ جات نمبر ۶۲۔۶۳) کا ضمیمہ ہے اور غالباً نمبر ۶۳ کے ساتھ شامل تھا اور جلد بندی کے وقت غلطی سے علاحدہ کر دیا گیا

ہے(۸۴)۔

جہاں تک باقر آگاہ کے سنہ وفات کا تعلق ہے، سبھی محققین نے، جن میں پروفیسر سروری، مولوی نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر یوسف کوکن، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر سیدہ جعفر بھی شامل ہیں، ۱۲۲۰ھ بتایا ہے اور مولوی محمد غوث کے تاریخی فقرے "قدمات فرد العصر" کا حوالہ دیا ہے۔ میر مبارک اللہ خا راغب کے درج ذیل شعر سے بھی یہی سنہ نکلتا ہے:

سروشم سال فوتش گفت باآہ بفردوس معلیٰ رفتہ آگاہ (۷۰)

صاحب "حدیقتہ المرام" (۸۵) اور "صبح وطن (۸۶) کی تحقیق بھی یہی (۱۲۲۰ھ) ہے لیکن یوسف کوکن کی کتاب میں ایک شعر درج ہے جس سے آگاہ کی وفات کا سنہ ۱۲۲۱ھ برآمد ہوتا ہے:

قیل لی ثم بمدراس غرب ارخت، حالا باقرالعلم ذھب،
(نامعلوم) (۸۷)

اس کے علاوہ مخطوطات انجمن ترقی اردو (کراچی) جلد پنجم میں یہ قطعہ ملتا ہے جس کے آخری مصرعے سے بھی سنہ وفات ۱۲۲۱ نکلتا ہے:

چو رفت از دار دنیا بست آگاہ دریغا وا دریغا وا دریغا
پئے تاریخ آں از درد جاں کاہ نمودم سر بجیب فکر والا
بگفتا از سر ماتم، سروشم فآھا ثم آھا ثم آ... (۴۷)

آخر الذکر قطعہ، تاریخ وفات اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ یہ ابو طیب خاں والا کا ہے، جو باقر آگاہ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اس تاریخی قطعے کے آخری مصرعے کے اعداد ۱۱۸۱ ہوتے ہیں اور اس میں سر ماتم یعنی "م" کے ۴۰/ اعداد جمع کیے جائیں تو ۱۲۲۱ کا مجموعہ برآمد ہوتا ہے۔

حوالے اور حواشی:

(۱) باقر آگاہ نے "روپ سنگار" کے نام سے نائکہ بھید کے موضوع پر ایک مثنوی لکھی ہے۔ جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ سنسکرت اور برج بھاشا پر بھی عبور رکھتے تھے۔ چناں چہ اس کتاب میں انھوں نے خود اپنے کتب اور دوہے بھی شامل کر دیے ہیں۔

(۲) پروفیسر عبد القادر سروری - فہرست اردو مخطوطات - جامعہ عثمانیہ - حیدرآباد ص ۱۸-
(۳) ڈاکٹر زور - "تذکرۂ مخطوطات" ادارۂ ادبیات اردو - (جلد اول ص ۶۷-
(۴) عطا کاکوی (مرتب) "شمع انجمن" ص ۱۵-
(۵) محمد غوث خاں اعظم (مرتب) "صبح وطن" - ص ۹-
(۶) محمد مہدی واصف (مرتب) تذکرۂ "حدیقۃ المرام" - ص ۲۶-
(۷) قدرت اللہ گوپاموی (مرتب) تذکرۂ "نتائج الافکار" - ص ۶۳-
(۸) افسر صدیقی امروہوی - مخطوطات انجمن ترقی اردو - کراچی (جلد اول) - ص ۱۳-
(۹) ڈاکٹر زور - تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول) ص ۷۸-
(۱۰) ایضاً (جلد سوم) ص ۲۲۹-
(۱۱) افسر صدیقی - مخطوطات انجمن - کراچی - (جلد اول) ص ۱۳-
(۱۲) نصیر الدین ہاشمی - "کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست" - ص ۸۲-
(۱۳) ڈاکٹر محمد غوث - امانتی کتب خانہ - خاندان شرف الملک (مدراس) کے اردو مخطوطات - ص ۸۹-
(۱۴) مخطوطہ نمبر ۴۹ - ۶۱۶-
(۱۵) مخطوطات نمبر ۵۲ / ۸ - ۵۳ / ۹ - ۵۴ / ۱۰ - ۵۵ / ۱۱ - ۵۶ / ۱۲-
(۱۶) مخطوطہ نمبر ۷۶ / ۱۱۶ (جدید)-
(۱۷) مخطوطہ نمبر ۴۸ / ۹۶-
(۱۸) مخطوطہ نمبر ۷۳-
(۱۹) مخطوطہ نمبر ۲۷۸-
(۲۰) مخطوطہ نمبر ندارد - بحوالہ تذکرۂ سعید ص ۶۱-
(۲۱) مخطوطہ نمبر [illegible]-
(۲۲) مخطوطہ نمبر ۱ (۱-۱۱ امیات)-
(۲۳) ڈاکٹر زور - تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول) ص ۸۷-
(۲۴) مخطوطہ نمبر [illegible]-
(۲۵) مخطوطہ نمبر ۱/۷ ۴۳-
(۲۶) مخطوطہ نمبر ۱۱/۴۹-
(۲۷) مخطوطہ نمبر ۱/218 - 1957 - N. M. / ۲۳۱ -
(۲۸) مخطوطہ نمبر ۱۳-
(۲۹) مخطوطہ نمبر ۳ (بحوالہ تذکرۂ سعیدیہ ص ۶۱)-
(۳۰) "من جیون" کا سنہ تصنیف درج ذیل شعر میں ظاہر کیا گیا ہے-

تھے بارہ سو اوپر چھ برس جب ؎ نسخہ خوش ہوا مرتب

(۳۱) مخطوطہ نمبر (۳) ۷۵۴) - (۳) ۴۵۸-

(۳۲) مخطوطہ نمبر ۱۵-

(۳۳) مخطوطہ نمبر ۴۰-

(۳۴) مخطوطہ نمبر ۲ ی ۷-

(۳۵) مخطوطہ نمبر ۴۵ / ۹۵۳ / ۲۵۰-

(۳۶) مخطوطہ نمبر 6500 / 282 -

(۳۷) مخطوطہ نمبر ۲ (تذکرۂ سعید ص ۶۰)-

(۳۸) ڈاکٹر زور - تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول) ص ۸۷-

(۳۹) مخطوطات نمبر ۱۶ - ۲۹۶ - ۷۷۹ - ۷۸۴-

(۴۰) مخطوطات نمبر (۳) ۴۲۱ - (۳) ۴۸۹-

(۴۱) مخطوطہ نمبر ۱۳۴-

(۴۲) مخطوطہ نمبر ۱۰۶۵ / ۵۶-

(۴۳) مخطوطہ نمبر ۹۲۱ / ۳۵-

(۴۴) مخطوطات نمبر ۶۲ - ۶۳ - ۶۴ - ۸۹۵-

(۴۵) مخطوطات نمبر ۴۴ - ۴۵ - ۱۲۷-

(۴۶) مخطوطات نمبر ۲ (فضائل و مناقبت) - (۳) ۳۲۴-

(۴۷) مخطوطہ نمبر ۳۸۶ / ۴۹-

(۴۸) مخطوطہ ۴۴-

(۴۹) کتب خانہ۔ آصفیہ - مخطوطہ نمبر ۱۸۳-

(۵۰) برٹش میوزیم -- مخطوطہ نمبر اورینٹل ۶۵۰۵-

(۵۱) ببلیوتک نیشونل - مخطوطہ نمبر (۸۷۲)-

(۵۲) مخطوطہ نمبر ۲۹-

(۵۳) مخطوطہ نمبر 1540 - ۱۹۶۱ - N. M. / ۲۳۲ -

(۵۴) مخطوطہ نمبر ۱۰۹۴ / ۸۵۸-

(۵۵) ڈاکٹر زور - تذکرۂ مخطوطات (جلد اول) ص ۷۷-

(۵۶) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ - اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۴۳۵-

(۵۷) فرائد در فوائد اس کا ہے نام ؎ خدا اس کوں کرے خوبی سے اتمام

(۵۸) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ - اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۴۳۴-

(۵۹) افضل الدین اقبال - مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما - ص ۱۶۸-

(۶۰) افضل الدین اقبال - مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما - ص ۱۶۸-

(۶۱) "گلزار عشق" کے مخطوطہ مخزونہ انجمن ترقی اردو - کراچی (جلد ۵ - ص ۲۱۵) کے اختتام پر ۱۴/ اشعار کا ایک قصیدہ ہے - جس کی ردیف "عشق" ہے - اور جس کے آخری مصرع "جلوہ زار طور ہے گلزار" سے تاریخ تصنیف ۱۲۱۰ھ برآمد ہوئی ہے -

(۶۲) "فہرست مخطوطات" سالار جنگ ص ۷۶۶ -

(۶۳) "یورپ میں دکنی مخطوطات" ص ۴۵۵ -

(۶۴) مخطوطات انجمن - کراچی - (جلد ۵) ص ۱۱۰ -

(۶۵) "فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ - ص ۱۸ -

(۶۶) تذکرۂ اردو مخطوطات - ادارۂ ادبیات اردو (جلد اول) ص ۷۷ -

(۶۷) "فہرست مخطوطات اردو کتب خانہ - سالار جنگ - ص ۲۷۶ -

(۶۸) باقر آگاہ - ص ۱۲۶ -

(۶۹) باقر آگاہ - ص ۱۲۶ -

(۷۰) فہرست مخطوطات اردو کتب خانہ - سالار جنگ - ص ۲۷۶ -

(۷۱) مخطوطات انجمن - کراچی - (جلد ۵) ص ۵۹ -

(۷۲) مخطوطات کتب خانہ - آصفیہ (جلد ۲) ص ۲۶۶ تا ۲۶۵ -

(۷۳) ص ۱۲۶ -

(۷۴) تذکرۂ اردو مخطوطات - ادارۂ ادبیات اردو (جلد اول) مخطوطہ نمبر - ۲۲۰ -

(۷۵) تذکرۂ اردو مخطوطات - ادارۂ ادبیات اردو (جلد اول) مخطوطہ نمبر - ۲۴۱ -

(۷۶) اردو مخطوطات کتب خانہ - جامعہ عثمانیہ - ص ۱۷ -

(۷۷) اردو مخطوطات کتب خانہ - جامعہ عثمانیہ - ص ۱۴ -

(۷۸) کتب خانہ - سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست - ص ۴۲۶ -

(۷۹) افضل بقال نے آگاہ کی غزلوں کی تعداد سہواً ۳۰۳ بتائی ہے - مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما ص ۱۶۹ -

(۸۰) کتب خانہ - رحمانیہ کے اردو مخطوطات - مخطوطہ نمبر ۹۲ - ص ۱۱ -

(۸۱) ص ۴۴۵ تا ۴۴۷ -

(۸۲) ص ۸۳ - ۸۴ -

(۸۳) تذکرۂ اردو مخطوطات - ادرۂ ادبیات اردو (جلد ۱) ص ۱۱۲ -

(۸۴) تذکرۂ اردو مخطوطات - ادرۂ ادبیات اردو (جلد ۱) ص ۱۱۲ -

(۸۵) یوسف کوکن - باقر آگاہ - ص ۵۰-

(۸۶) مہدی واصف کے الفاظ یہ ہے "آپ نے ۱۴/ ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی ص ۲۷-

(۸۷) چہاردہم ماہ ذی حجہ سنہ الف و مائتین و عشرین ہجری گریبان قبائے مستعار ہستی دریدہ-

(۸۸) باقر آگاہ - ص ۵۰-

(۸۹) باقر آگاہ - ص ۲۷۳-

(شعبہ۔ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے خصوصی امدادی پروگرام یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سہ روزہ قومی سیمنار (۲۶/ تا ۲۸/ اکتوبر ۹۴۔) میں پڑھا گیا)-

مطبوعہ "سب رس" حیدرآباد۔ اگست ۱۹۹۴ء-



دکنی اردو میں خمریہ شاعری

خمریہ شاعری سے مراد وہ شاعری ہے، جس میں شراب اور اس کے متعلقات جیسے مئے خانہ ۔ساقی ۔رند ۔پیر مغاں ۔جام ۔صراحی ۔ مستی و بے خودی وغیرہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے ۔عربی اور فارسی میں بھی یہ موضوع کافی مقبول رہا ہے چناں چہ عربی میں ابو نواس اور فارسی میں خیام اور حافظ نے خمریاتی شاعری کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔ فارسی شاعری کے اتباع اور اثر پذیری کی وجہ سے اردو شاعری کا دامن، ہر زمانے مد خمریات سے مالا مال رہا ہے اور شاعروں کے نزدیک یہ موضوع دل چسپی کا باعث رہا ہے۔

خمریہ شاعری کے سلسلے میں یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ خمریات میں جس شراب کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے وہ لازماً افشردۂ انگور نہیں ہوتی بلکہ شراب معرفت بھی ہو سکتی ہیں ۔چوں کہ صوفی شاعروں نے مشاہدۂ حق کی گفتگو بھی بادہ و ساغر کے پردے میں کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے ان کے نزدیک شراب سے مراد بادۂ عرفان الہیٰ ، ساقی سے خمستان ازل کا ساقی ، پیر مغاں سے مرشد کامل ۔ساغر سے دل اور مئے کدے سے پیر طریقت کی خانقاہ ہے ۔چند شعر دیکھیے:

اٹھے کبھی گھبرا کے تو مئے خانے کو ہو آئے　　پی آئے تو پھر بیٹھ گئے یاد خدا میں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو　　دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اللہ اللہ کیا مزا مرشد کے مئے خانے میں ہے　　دونوں عالم کی حقیقت ایک پیمانے میں ہے

شراب اور اس کے متعلقات سے شعرا نے نہ صرف بھٹی کی شراب اور بادۂ معرفت کے تجربات اور مشاہدات کی عکاسی کی ہے بلکہ سماجی ، سیاسی اور انقلابی موضوعات کی ترجمانی کے سلسلے میں بھی، خمریہ شاعری کی اصطلاحوں سے کام لیا ہے:

یہ مئے خانہ ہے جام جم نہیں ہے — یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے
ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے — ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے
یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
نشہ پلاکے گرانا تو سب کو آتا ہے — مزا تو جب ہے کہ گرتے کو تھام لے ساقی

جہاں تک اردو میں خمریہ شاعری کا تعلق ہے، اس کے اولین نمونے دکنی ادب میں ملتے ہیں اور پھر بعد کے زمانے میں جن شاعروں نے اس موضوع پر بطور خاص داد سخن دی ہے، ان میں مرزا غالب ۔ ریاض خیر آبادی ۔ جگر مراد آبادی ۔ عبد الحمید عدم ۔ ساغر ۔ جوش اور صفی اورنگ آبادی کے نام اہمیت رکھتے ہیں ۔

جوش ملیح آبادی، خمریہ شاعری کے حوالے سے اپنے آپ کو حافظ خیام کہتے ہیں:

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں — کہ وہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ریاض خیرآبادی اردو خمریات کے بادشاہ ہیں اور بقول محمد سبحان اللہ ان کے کلام میں ایک ہزار تین سو چھیاسٹھ اشعار خمریہ مضامین سے متعلق ہیں (۱) ۔

جہاں تک دکنی ادب میں خمریات کا تعلق ہے موجودہ معلومات کی روشنی قطب شاہی عہد کا شاعر سید محمود اردو کا قدیم ترین شاعر ہے جس کے کلام میں شراب اور اس کے متعلقات کا تذکرہ ملتا ہے ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے "دیوان حسن شوقی" کے مقدمے میں محمود کی ایک غزل اور "تاریخ ادب اردو" (جلد اول) میں اس کی غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار درج کیے ہیں جن میں سے درج ذیل اشعار خمریات سے متعلق ہیں:

شیخ د میں ہم مشرباں ہیں لیک ہنگام بہار
وہ چھپیا پیوے شراب، ہور میں پیدا شراب

جیو جدھاں ہمراہ ہوئے باغ سوں بہتر ہے دشت
یھاں بھڑے بھر بھر پیالے، وھاں بھڑے مینا شراب

خلق تے رنداں منیں محمود مینا کھول دیکھ

جیو شراب ہے، دل شراب، سرشراب ہے پا شراب

قطب شاہی عہد کے دوسرے شاعروں میں محمود کے بعد سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء) دوسرا شاعر ہے جس کے کلام میں خمریات کے وافر نمونے ملتے ہیں۔ محمد قلی اردو کا پہلا قادر الکلام شاعر ہے جس نے پچاس ہزار اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ محمد قلی ہی نے اردو میں خمریاتی شاعری کی طرف باقاعدہ توجہ کی ہے۔ وہ شباب اور شراب کا رسیا تھا۔ آئے دن اس کے محلوں میں رقص و سرور کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، جن میں ساغر و جام کے دور چلتے اور مطرب بادشاہ وقت کی غزلیں سازوں پر پیش کر کے انعام و اکرام حاصل کرتے تھے۔ محمد قلی ایک حقیقت پسند شاعر تھا اس نے اپنی نجی زندگی کی ساری تفصیلات اپنے کلام میں بے کم و کاست بیان کی ہیں جس میں اس کی عیش کوشی اور شغل مے نوشی بھی شامل ہے:

سکی آج پیالا انند کا پلا مج　　یاقوت ادھراں کی مستی دلا مج

اسے نئیں ہے سورج چاند پیالے کی پروا　　تمھارے ہونٹ اچھیں گے جبے بجائے قدح

سرمستی و سرشاری اور کیف و مستی کے علاوہ محمد قلی کی خمریات کی ایک اور نمایاں خصوصیت نغمگی و موسیقیت بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی بیش تر غزلیں ساز اور آواز کا جادو جگانے کے لیے لکھی ہیں:

ساقیا آ شراب ناب کہاں　　چند کے پیالے میں آفتاب کہاں

مد کے پیالیاں کا دور چلتا ہے　　نقل مد کا کہاں کباب کہاں

او کنول مکھ میں نیر ہے سنپور　　اس کے انگے تنک شراب کہاں

محمد قلی نے بعض مسلسل اور مربوط غزلوں میں "شراب" اور "ساقی" کے الفاظ کو ردیف کے طور پر استعمال کر کے خمریاتی شاعری سے اپنی والہانہ دل چسپی کا اظہار کیا ہے:

صبا ہی او مکھ دیکھ پینا شراب　　فرح بخش ساعت میں لینا شراب

ترے حسن تھے دان دے شاہ کوں　　او مکھ کے عرق تھے سو پینا شراب

تری نین مستی ہو روں روں چڑی　　پرت سے بھریا دل کا لینا شراب

ازل تھے نبیؐ حب قطب پیوتا　　ترے پیالے سوں ساقی دینا شراب

....

مئے لعلی تھے مکھ زردی ہمارا دور کر ساقی	مجالس زہرہ رقاصی سوں توں پرنور کر ساقی
جکوئی ہے عشق میں ثابت سدا، ہے جیونا اس کا	سو اس کے ناؤں سوں مئے خانہ سب معمور کر ساقی
نہ جانوں روز محشر کیوں لچھے گا جاب و پرسش منج	کہ مئے خواراں منے اب تو ہمن مشہور کر ساقی

محمد قلی فارسی شاعری سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے خواجہ حافظ کا اثر بھی قبول کیا۔ وہ حافظ شیرازی کا پہلا مترجم بھی ہے۔ بقول ڈاکٹر زور " محمد قلی کی شاعری پر سب سے زیادہ حافظ کا رنگ مسلط ہے۔ اس نے سینکڑوں غزلیں اسی رنگ میں لکھیں اور حافظ کی پچاس غزلوں کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ اور یہ ترجمہ نہایت کامیاب سمجھا جا سکتا ہے (۲)۔ خمریات کے موضوع پر حافظ کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

آنکس کہ بدست جام دارد	جو کو کہ ہتیلی جام لیا
سلطانی جم مدام دارد	سلطانی جم مدام لیا
آبی کہ خضر حیات ازد یافت	پانی کہ خضر حیات پایا
درمے کدہ جو کہ جام دارد	مد گھر تھے تنک سو جام لیا

....

گل بے رخ یار خوش نباشد	پھل بن رخ یار خوش نہ دسیے
بے بادہ بہار خوش نباشد	بن مد پھلی بھار خوش نہ دسیے
طرف چمن و طواف بستاں	گشت چمن و ہوائے کلیاں
بے لالہ عذار خوش نباشد	بن پیالے کنار خوش نہ دسیے

....

سخن درست نمی توانم دید	درست بات کتاہوں نہ جاسے منج تو دیکھا
کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم	شراب پیوے حریفاں و میں نظارہ کروں
گدائے مے کدہ ام لیک وقت مستی بیں	شراب خانہ کا مسکیں ہوں دیکھ مستی میں
کہ ناز بر فلک و حکم برستارہ کنم	کہ لاڈ انبر پہ کروں حکم تل سو تارہ کروں
مراکہ نیست رہ ورسم لقمہ پرہیزی	جو منج میں نئیں ہیں پرہیزگاری کے کاماں
چرا مذمت رند شراب خوارہ کنم	شراب خور کوں اہانت سوں کیوں اشارہ کروں

محمد قلی نے اپنے محبوباؤں کو مخاطب کر کے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں بھی خمریاتی شاعری کی جھلک موجود ہے:

پیالا لیو مرے اچھے لالا — کہ او پیالا ہے سورج تھے نرالا

اس کی خمریاتی شاعری، صرف غزل اور نظم تک محدود نہیں بلکہ رباعی کی صنف میں بھی یہ اپنی بہار اور رنگارنگی دکھاتی ہے۔ محمد قلی کے دیوان میں ایک سے زائد ایسی رباعیاں موجود ہیں جن میں شراب اور اس کے متعلقات کا تذکرہ ملتا ہے:

مستی کے ملک میں ہے جہاں بانی منجے — خوباں کوں دیکھیں میں ہے مسلمانی منجے
خمار کا خم خانہ اہے ٹھاؤں میرا — ہر مد کا سو بند نگیں سلیمانی منجے

درج ذیل رباعی کے مطالعہ سے عمر خیام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

ہے پھل کا ہنگام مدسوں باراں حاضر — پھولاں کے چمن سارے ہیں یاراں حاضر
اس وقت میں کیوں توبہ کیا جائے منجے — توبہ شکناں ہور نگاراں حاضر

محمد قلی کے علاوہ قطب شاہی عہد کے دیگر شاعروں میں، جنھوں نے خمریات کو موضوع سخن بنایا ہے، ان میں عبد اللہ قطب شاہ اور ملک الشعرا ملا غواصی کے نام اہمیت رکھتے ہیں محمد قلی قطب شاہ کی طرح عبد اللہ قطب شاہ کی غزلوں میں بھی محبوب کے حسن و جمال، رفتار و گفتار، لب و رخسار اور چشم و ابرو کی تعریف و توصیف بھی ملتی ہے اور خمریاتی شاعری کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اپنے نانا کی طرح اس نے بھی شراب کی تعریف میں متعدد شعر کہے ہیں: (۶)

ہوا کا وقت ہے خوش اس ہوا میں — صراحی ہور پیالے سات گھمنا
مستانے سب گئے ہیں مئے خانے آج گھر گھر — مدپینے کی رضا کی جی تھے ہے چاند بالا
ہوا مد پینے کا آیا ہے پیارے — تو مد پینے کو من کرتا اتالا
خبر دے جام کوں ساقی کہ دور آیا ہے پھر جم کا — صراحی ہات میانے لے انگن میں چاند ہو جھمکا

عبد اللہ قطب شاہ کی خمریات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کلام میں ایک سے زاید قوافی کے اہتمام کی وجہ سے لفظوں کی جھنکار اور نغمگی اور موسیقیت کا

احساس نمایاں ہو جاتا ہے:

پیالے، پیالے، پیالے، یو پینا دنیا میں۔ دنیا میں تہی کچھ ہے جینا
امنگ سوں آج اے ساقی دے پیالے بھر سے باقی کہ گزری حد تھے مشتاقی ترت کر عیش کا چارا

بسنت کے تیوہار کے موقعے پر بھی شغل مے نوشی بادشاہ وقت کی خوشیوں کو دوبالا کرتی ہے:

بسنت آیا کھلایا پھول لالا سکھی لیا اب صراحی ہور پیالا
لا صراحی کو پیالے سوں گلے سر خوشی کا کام فرمایا بسنت

عبداللہ قطب شاہ کا ملک الشعرا ملا غواصی بھی خمریاتی شاعری کا دل دادہ تھا۔ اس کے کلام میں شراب و مے خانہ ۔ صراحی و پیالہ اور ساقی و خرابات کا بار بار تذکرہ ملتا ہے ۔ چند شعر دیکھیے:

پلا مدمست اے ساقی کہ منج عادت ہے پینے کا ہو سرخوش دور یک دھر تھے کروں گا رنگ سینے کا
دنیا ہے رہ گذر، معشوق سوں خوش بیں پیالے پی کہ ہوتا ہے کدورت دور پیالے دونی پینے میں

ملک الشعرا غواصی کو قدیم خمریاتی شاعری میں اس لیے بھی امتیاز حاصل ہے کہ اس نے "پیالا" کی ردیف میں ایک ایسی مسلسل غزل لکھی ہے، جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دکنی شاعری میں "ساقی نامہ" کی طرح "پیالا" بھی ایک صنف سخن تھی۔ غواصی کا بیان ہے کہ اس کے پیش رو اور ہم عصر متعدد شاعروں نے اس صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ غواصی کا "پیالہ" ملاحظہ کیجیے:

پیا کے مست ادھر کی پایا جب خیر پیالا پرت والیاں کوں شکرانے کی بانٹیا تب شکر پیالا
صراحی گردن اونچی کر اس سوں آئے خدمت میں کیا اپنی محبت ہور کرم کا جیوں نظر پیالا
طلب پیالے پہ دھرتے ہیں پیالا اس سبب شاہاں جو رازاں عین باطن کے کتا ہے کھول کر پیالا
جو کوئی عاشق ہو پیالا پیونے جانیا یقیں جانو اسے ہرگز نہ کر سکے کدھیں کوں بے خبر پیالا
مری ہستی منے بسی سو مستی کد نہ ہوے خالی کرم کر ساقی کوثر دیے ہیں منج کوں بھر پیالا
اگرچہ شاعراں بولے ہیں پیالے خوب خوب اما غواصی کا پیالا سب کے پیالاں میں ہر پیالا

قطب شاہی عہد میں محمد قلی، عبداللہ قطب شاہ اور غواصی کے یہاں خمریاتی شاعری کا مسلسل اور مربوط ارتقا ملتا ہے۔ ان کے خمریہ اشعار میں رندی و سرمستی کے

ساتھ ساتھ ہوسناکی، خوبرویوں سے چھیڑ چھاڑ اور جذبات کی جولانیوں کی تصویر کشی بھی ملتی ہے۔ اس عہد کے دوسرے شعرا کے یہاں شراب اور اس کے متعلقات کی ترجمانی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ چند شعر دیکھیے:

جدھاں تے مے پرستی سو ہوا رنداں کے مذہب میں
تدہاں نے ناؤں بھاتا نئیں منجے ہرگز نمازی کا (سالک)

دائم شراب شوق کوں پی کر متا اچھوں
باتاں چھپے سو کھول کے نت بولتا اچھوں (میراں جی خدا نما)

ترے ہات میں شاہ جم جام اچھو
ہمیشہ بغل میں دل آرام اچھو (طبعی)

جہاں تک عادل شاہی دور میں خمریات نگاری کا تعلق ہے اس عہد میں قطب شاہی دور کی طرح خمریہ شاعری کا مربوط اور مسلسل ارتقا نہیں ملتا۔ نصرتی، حسن شوقی شاہی، ہاشمی، شاہ سلطان اور شغلی جیسے صاحب دیوان شاعروں کے ہاں بھی شراب اور اس کے لوازمات کا تذکرہ ضمنی طور پر صرف اکا دکا اشعار ہی میں ملتا ہے۔ سوائے شاہ معظم کے، بیجاپور کے کسی بھی شاعر نے خمریات کو باضابطہ موضوع سخن نہیں بنایا شاہ معظم کے تذکرے سے قبل اس عہد کے دوسرے شاعروں کے خمریاتی اشعار ملاحظہ کیجیے:

سرمست نصرتی سوں چل سی نہ تج حریفی
خوباں کی انجمن کا ہے او رند لا ابالی (نصرتی)

ہوئیں مست تج نین تے جنم عاشقوں کے من
جس مئے میں تج کرشمہ نہ ہوئے سو اثر نکو (")

مجے دیدار ساقی کا ہوا تو ووہی دسے عالم
سکندر کا وو درپن لے کروں کیا جام لے جم کا (ہاشمی)

تب تے شراب کوں میں بولیاں پلیت پانی
چاکھا ہوں پاک جب تے اے دھن ترے ادھر مست (")

تج ادھر مئے شوق سوں چاکیا سو متوالا ہوا

آزاد مستاں ہوئے کر چھب سوں نروالا ہوا (سلطان)
آرے کلال منج کوں پیالا پلا میا کا
تامست ہوکے دیکھوں مکھڑا علی پیا کا (شاہی)
پیو جیو کا گسائیں پیوں سوں پرت لگائیں
پینا شراب پیو مل پاتے ارت پیاکا (")
تج حسن کا دیپک جنے دیکھا سو پروانہ ہوا
تیرے ادھر کا مئے جنے چاکیا سو دیوانہ ہوا (شغلی)
تج وجہ کی مئے تاب تھے ناتاب یا بے تاب تھا
تج بچن آواز تے بے ہوش تھے دانا ہوا (")

جیسا کہ اس سے پہلے کہا گیا ہے، شاہ محمد حسینی معظم، عادل شاہی دور کا ایک ایسا قادر الکلام شاعر ہے جس کی شاعری میں خمریات کے وافر نمونے ملتے ہیں اس نے بادہ و جام اور ساقی و میخانہ کی تعریف میں متعدد شعر کہے ہیں۔ معظم، ملک الشعرا نصرتی اور ہاشمی بیجاپوری کا ہم عصر شاعر ہے۔ اس نے متعدد غزلوں میں خمریاتی مضامین باندھے ہیں۔ بعض غزلیں تو ابتدا سے آخر تک اسی موضوع کا احاطہ کرتی ہیں:

مجھے دلبر کے لب تھے نت پینا جم جام خوش لگتا ۔۔۔ نچھڑنا مجھ کو بھاتا نئیں وصل آرام خوش لگتا
ایمان دے کتے ہیں شراب لینا ۔۔۔ دوچار جام پی کر دارو خمار کرنا
اے ساقی مہرباں تجھ سے عرض ہے یک پیالے کا ۔۔۔ کدھیں ہوتا تو بہتر تھا نقل تجھ لب رسالے کا
مشرق طرف صبح کا دستا ہے دیکھ اجالا ۔۔۔ ساقی منگا تو بیگی دو نقل ہور پیالا
جنت منے کہاں ہے یہ جام ارغوانی ۔۔۔ خالص شراب لاکر تجھ ہات سوں پلانا
صراحی مے سے پر کر کرلیا تھا ہات میں اپنے ۔۔۔ مجھے بھی مست کرنے کو نشا سرشار آیا تھا
مجھ کو اس دنیا منے کیا خوب مئے خانہ دسیا ۔۔۔ روشن منور بے بدل نادر سو خم خانہ دسیا
جب سے پیا ہوں جام میں اس مست کے دیدار کا ۔۔۔ تب سے دیکھو دستا مجھے سب شہر اور بازار مست
مل یار سے پینا مئے باقی حیات ہے لگ ۔۔۔ پینا بی اور پلانا ساقی یہ سات ہے لگ
بات سوں ساقی کے جم جس کو میسر ہے جام ۔۔۔ دولت عظمیٰ کتے عیش ہے اس کو مدام

مندرجہ بالا اشعار میں معظم نے شرابِ انگور کی تعریف اور اس سے رونما

ہونے والے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے لیکن اس کے خمریہ اشعار صرف و محض شراب مجازی کے عکاس و ترجمان نہیں بلکہ بادۂ عرفان سے بھی لبریز ہیں۔ وہ حضرت قادر لنگا کوتال کا معتقد اور مرید تھا اور اپنی غزل کے کم و بیش ہر مقطعے میں اپنے مرشد کا نام لینا ضروری سمجھتا ہے۔ معظم کی شراب حقیقی کے چند مرقعے ملاحظہ ہوں:

پلا مجھ دور پھر ساغر اے حضرت ساقی کوثر
جس کیف کے پیے سے روشن ضمیر ہوتا
ساقی ہے تو ہمارا دے جام بھر لبالب
قادر ہوا ہے ساقی ڈرتا ہے کیوں معظم
پیتے ہیں زاہداں سب کیوں نئیں پیتا معظم

معظم عرض کرتا ہے پیالے اور نوالے کا
پیدا کتے ہیں اول جم کا اوجام پینا
سرمست کر دکھا مجھ سرشار یا محمدؐ
قاضی اپر ہے ظاہر کیا ہے حجاب لے لے
قادر ہوا ہے ساقی اور گل عذار خوش تر

معظم نے اپنے خمریاتی کلام میں نہ صرف شراب مجازی اور بادۂ عرفان کے مضامین اور نکات پیش کیے ہیں بلکہ انھیں اردو کا پہلا " ساقی نامہ " لکھنے کا اعزاز بھی حاصل ہے(۳)۔ ساقی نامہ اگرچہ ساقی و شاہد، مئے و مینا، نغمہ و مطرب اور کیف و مستی کے مضامین سے عبارت ہے لیکن اس میں کبھی کبھی تصوف و حکمت، دنیا کی ناپائداری اور غم روزگار کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔ ایک عرصہ تک محمد فقیہہ دردمند کے ساقی نامے کو اردو کا پہلا ساقی نامہ سمجھا جاتا تھا لیکن جدید تحقیق کی روشنی میں، اردو کا پہلا " ساقی نامہ " لکھنے کا سہرا شاہ معظم کے سر ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد معظم کے ساقی نامے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

" معظم کے ساقی نامے کا موضوع بظاہر مئے و نغمے کا مجازی موضوع معلوم ہوتا ہے لیکن پوری مثنوی بار بار پڑھ جائیے اس کے باوجود یہ تصفیہ کرنا مشکل ہوگا کہ شاعر کے فکر و فن کو قوت محرکہ حقیقت سے مل رہی ہے یا مجاز سے تاہم معظم کے یہاں یہ چیز کھٹکتی نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ مجاز و حقیقت کے تار حریر دو رنگ سے اپنی نظم کا تانا بانا تیار کرنے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں " (۴)

معظم نے موضوع کے اعتبار سے اپنے " ساقی نامہ " کو دو حصوں میں تقسیم کیا

ہے۔ پہلے حصے میں شیشہ و ساغر اور سرمستی و سرشاری کے مضامین شاعرانہ حسن کے ساتھ پیش کیے ہیں جب کہ اس کا دوسرا حصہ مطرب و نغمہ یا ساز اور آواز سے پیدا ہونے والی سرور و نشاط کی کیفیات کا عکاس ہے۔ "ساقی نامہ" کے آغاز میں خدا، حضور اکرمؐ اور حضرت علیؓ کی ساقی گری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

الٰہی توں ساقی ازل سوں مدام　　پلاتا ہے توں جام سب کو تمام

ہمارا ہے ساقی خدا کا رسول　　مناجات میرا کرے گا قبول

نبی کا سو نائب علی ہیں کتے　　او بر حق خدا کا ولی ہیں کتے

اسی سوں محشر میں مجھ کام ہے　　اسی سوں دنیا میں آرام ہے

ساقی حقیقی سے تخاطب کے بعد پھر معظم شراب کی التجا اس انداز سے کرتے ہیں جیسے یہ شراب انگور ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ رات کے گذر جانے کے اندیشے کا اظہار بھی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ طلوع آفتاب سے پہلے جس قدر پی سکتے ہوں پی لیں (۵)۔

قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنت کے زوال کے بعد اردو شعر و ادب کی سرگرمیاں گولکنڈہ اور بیجاپور سے اورنگ آباد منتقل ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اورنگ آباد علم و ادب اور شعر و سخن کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے سرزمین دکن پر ابھر آیا۔

ولی اور سراج، اورنگ آباد کے شاعروں میں آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ قدآور اور باکمال سخن ور ہیں جن کے ساتھ ایک طرف دکنی شاعری کی عظیم روایات اختتام کو پہنچتی ہیں تو دوسری طرف ان شاعروں نے قدیم اردو شاعری کی روایت کا تسلسل شمالی ہند کی شاعری سے ملانے کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ جہاں تک اس دور کی خمریہ شاعری کا تعلق ہے۔ دیوان ولی میں شراب اور اس کے لوازمات کے بارے میں اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ سراج (۱۷۱۵ء تا ۱۷۶۳ء) نے خمریات کو باقاعدہ موضوع سخن بنایا ہے۔ سراج کی شاعری کا ایک اہم موضوع تصوف ہے۔ عشق میں ان کی از خود رفتگی مجاز اور حقیقت کی حدوں کو ایک کر دیتی ہے اور محبت کا دائرہ وسیع ہو کر کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ وہ حضرت شاہ

عبدالرحمن چشتی کے مرید تھے۔ اکثر و بیش تر ان کے اوپر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ بے خودی کے عالم میں اپنے گھر سے نکل کھڑے ہوتے، رات دن صحرا نوردی کرتے اور اپنا زیادہ تر وقت حضرت برہان الدین غریب کے آستانے پر گزارتے تھے۔ سراج کی شاعری میں ایک طرف بادۂ حقیقت کا رنگ دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف افشردۂ انگور کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

اردو شاعری میں تصوف کی روایت بہت عام ہے۔ متعدد شاعروں نے مسائل تصوف سے اپنی دل چسپی کا اظہار کیا ہے۔ اردو غزل گو شاعروں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو سینکڑوں شاعر ایسے مل جاتے ہیں جنھیں تصوف سے عملاً کوئی تعلق نہیں۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں تصوف کے مسائل خشکی پیدا کرنے والے مسائل بن جاتے ہیں اس کے برخلاف سراج کے کلام میں روحانی کیفیات اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ نمایاں ہیں۔ انھوں نے مسائل تصوف کو سادہ اور موثر انداز اور عشقیہ لب و لہجہ میں پیش کیا ہے:

شراب معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے	در و دیوار اس کوں مظہر محبوب ہوتا ہے
جام مئے الست میں بے خود ہوں اے سراج	دورِ شراب و شیشہ پر مل سیں کیا غرض
شراب نور جلالی میں بس کہ ہے لب ریز	سراج چرخ میں ہے آفتاب کا شیشہ
اے ساقی دل آگاہ کر دردسر سیں فارغ	مخمور ہوں عطا کر جام ازل کی مستی

اردو کے صوفی شاعروں میں سراج کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ صاحبِ دل صوفیوں کی صحبت میں بسر کیا تھا اور ان کے کلام میں روحانی تجربات کی حرارت بھی ملتی ہے لیکن ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ان کے ضخیم کلیات میں سو دو سو اشعار کو چھوڑ کر تصور عشق خالص مادی اور مجازی ہے۔ یہی حال ان کی خمریات کا بھی ہے جن میں شراب انگور کا کیف، مستی "بادۂ عرفان کی سرشاری کے مقابلے میں زیادہ نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پی کر شراب شوق کوں بے ہوش ہو بے ہوش ہو	جیوں غنچہ لب کوں بند کر خاموش ہو خاموش ہو
پلا کر جام اپنی چشم کی گردش سیں پے در پے	کیا ساقی نے مج کوں بے خبر آہستہ آہستہ

بہار ساقی ہے ، بزم گلشن ، ہیں مطربان چمن شرابی پیالہ گل ، سرسبز شیشہ ، شراب بو اور کلی گلابی

مئے نوش محبت نہ کرے منت مینا تجھ لب کی لطافت لب ساغر کوں کہاں ہے

جس کوں ہے ذوق مئے ساغر مدہوشی کا ہے اسے شغل تری چشم سیں مئے نوشی کا

ارے شراب خرد کے کیفی نہ کر توں دعوائے پختہ مغزی
مئے محبت کا جام پی توں کہ اب تلک ظرف خام ہے کا

مثال شیشہ کروں کیوں نہ سجدہ ساقی کوں شراب شوق ستی جام دل کیا لب ریز

سراج نے اپنے بعض خمریہ اشعار میں ناصح، زاہد اور شیخ کی ظاہرداری اور ریاکاری کی طرف طنزیہ انداز میں اشارے بھی کیے ہیں چند شعر دیکھیے:

اگر مسجد میں اے زاہد وو مست نیم خواب آوے ترے ہر دانہ تسبیح میں بوئے شراب آوے

اس ادب گاہ کوں تو مسجد جامع مت بوجھ شیخ بے باک نہ جا گوشہ مئے خانے میں

ترے سخن میں اے ناصح نہیں ہے کیفیت زبان قلقل مینا سیں سن کلام شراب

پری کی مجلس میں تجھ کوں زاہد ہنوز پروانگی نہیں ہے
مئے محبت کوں نوش کر توں کہ اب تلک مجھ کوں خادم دستا

سراج کو شیشہ و جام، مئے و مینا اور اس کے متعلقات سے فطری لگاؤ تھا جس کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے متعدد غزلوں کی ردیف "شراب" باندھی ہے۔ مثال کے طور پر ایک غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو:

ہوا ہے خط جبیں جس کو خط جام شراب نگین دل پہ کیا نقش اس نے نام شراب

ہے عکس چہرۂ خورشید رو پیالے میں سراج جلوہ نما ہے مہ تمام شراب

حوالے و حواشی:

(۱) حفیظ صدیقی کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان - اسلام آباد ص ۷۳-

(۲) کلیات محمد قلی قطب شاہ ص ۴۶-

(۳) ڈاکٹر حسینی شاہد - شاہ معظم ص ۱۹-

(۴) شاہ معظم ص ۹۵-

(۵) شاہ معظم ص ۸۸-

عہدِ عبداللہ قطب شاہ کے علمی، ادبی اور تہذیبی کارنامے

مملکتِ گولکنڈہ کا ساتواں فرماں روا عبداللہ قطب شاہ (پیدائش ۱۶۱۴ء تخت نشینی ۱۶۲۶ء وفات ۱۶۷۲ء) نہ صرف ایک رعایاپرور حکم ران، دکنی تہذیب و تمدن کا معمار، رقص و موسیقی کا دل دادہ، اہلِ علم و ہنر کا سرپرست اور مربی تھا بلکہ اقلیمِ سخن کا تاج دار بھی تھا۔ وہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کا نواسہ اور سلطان محمد قطب شاہ کا بیٹا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کا عہدِ حکومت ایک طرف، امن و سکون اور آسودگی و خوش حالی کا دور کہلاتا ہے تو دوسری طرف اندرونی بغاوتوں اور فتنہ و فساد کے باعث دور انتشار سے بھی عبارت ہے۔

سلطان عبداللہ کو خوش قسمتی سے میر قطب الدین نعمت اللہ، مرزا شہرستانی، خواجہ مظفر علی اور مولانا حسین جیسے نامی گرامی اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ بڑا علم دوست، دور اندیش اور منصف مزاج بادشاہ تھا۔ اس کی قدر دانی اور سرپرستی کا شہرہ سن کر دور دراز ممالک کے علما، فضلا اور اہلِ کمال حیدرآباد میں جمع ہوگئے تھے۔ فارسی کی مشہور لغت اسی کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ملا نظام الدین احمد نے اپنی معرکتہ آرا کتاب "حدیقۃ السلاطین" اسی دور میں لکھی۔ عبداللہ قطب شاہ کا عہدِ حکومت اردو شعرو ادب کی سرپرستی اور فروغ کے سلسلے میں ایک زرین دور کی حیثیت رکھتا ہے وجہی، غواصی، ابنِ نشاطی اور جنیدی جیسے بلند پایہ شعرا اور ادیب اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں، جنھوں نے بالترتیب "سب رس" "طوطی نامہ" "پھول بن" اور "ماہ پیکر" جیسی بے نظیر تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ علامہ ابنِ خاتون اسی دور کے ایک زبردست عالم تھے جن کی کوششوں سے حیدرآباد میں جگہ جگہ مدارس اور درس گاہیں قائم ہوئیں۔ ملک الشعرا غواصی نے اپنی ایک مثنوی میں عہدِ عبداللہ قطب شاہ کے پرکشش باغات و محلات، خوب صورت کوچہ و بازار، یہاں کی فرحت بخش آب و ہوا اور بلند پایہ درس گاہوں کے بارے میں

لکھا ہے:

جو شہر اس شاہ کا ہے حیدر آباد — سعادت ہور بقا اس کا ہے بنیاد
سراسر اس نگر کا جو ہوا ہے — دکھیاں کا سکھ مریضاں کا دوا ہے
بلندی میں مدرسے کا جو ہے نام — مگر آسمان کا ہے عین وو تھام
صفائی اس نگر کے جو ہیں بازار — ہزاروں اس میں چمناں ہور گلزار
کتاہوں سچ غلط نئں کوچ حاشا — کہ ہے یاں ہفت کشور کا تماشا
عمارت یاں کے نادر میں کہوں کیا — کہ چرخ اپنے جنم میں کئیں نہ دیکھیا
زمیں کے پیٹ پر اس شہر کی طرح — جو کوئی دیکھیا سو پایا فرخ پر فرح

عبداللہ قطب شاہ کو سیر و تفریح کا بہت شوق تھا۔ اپنی حکم رانی کے ابتدائی دور میں جب کہ مغلوں کی یورش شروع نہیں ہوئی تھی۔ وہ محمد قلی کی بنوائی ہوئی بلند و بالا عمارتوں "نبات گھاٹ" "کوہ طور" "باغ لنگم پلی" اور "حسین ساگر" کے محلات میں مقیم ہو کر جشن شاہانہ ترتیب دیا کرتا تھا۔ اس کی رعایا پروری، وسیع القلبی اور رفاہ عام کے کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے مورخین نے لکھا ہے کہ ۱۶۲۲ء میں جب پورے ہندوستان میں ایک خوف ناک قحط ظہور پذیر ہوا تھا تو کس طرح اس نے مصائب قحط کو دور کرنے کے لیے حیدر آباد میں جگہ جگہ کنوئیں کھدوائے ہر محلے میں غلے کی تقسیم کا لنگر جاری کیا اور "ندی محل" کے میدان میں نماز استقا پڑھوائی تھی۔ ان کوششوں اور تدابیر کے باوجود بھی جب بے شمار لوگ لقمہ اجل بن گئے تو ایک لاکھ افراد کے کفن دفن کے سارے انتظامات سلطنت کی طرف سے انجام دیے گئے۔(۲)

قطب شاہی مورخین کا بیان ہے کہ سلطان عبداللہ مختلف سماجی ثقافتی اور ادبی امور میں اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کے نقش قدم پر چلتا تھا اور اس کے دور میں ان تمام تہذیبی اور مذہبی تقاریب کا احیا عمل میں آیا جنھیں اس کے والد محمد قطب شاہ نے موقوف کر دیا تھا۔ عہد محمد قلی کی تعیش پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے لکھا ہے کہ:

"شہر حیدر آباد کی ترقی کے ساتھ اہل شہر میں تعیشات کی بھی فراوانی ہو گئی تھی اور ہر جگہ عیش و عشرت کا سامان مہیا تھا جو شہری

زندگی کا خاصہ ہے۔ چوں کہ قطب شاہی سلطنت میں امرا کی کثرت
تھی اور ملک میں خوش حالی تھی۔ اس لیے ان کی بے کاری اور فارغ
البالی کی جوہ سے ملک میں عیش و عشرت کا سامان ہونا ضروری تھا۔
اس میں خود باشاہوں کی زندگی بھی ثرانداز تھی، یہ کچھ خلاف قیاس
نہیں ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تعشیات میں اضافہ ہوا
کیوں کہ بادشاہ خود عیش پسند تھا۔" (۳)

محمد قلی قطب شاہ کا جانشین سلطان محمد قطب شاہ چوں کہ ایک پاکیزہ اخلاق، اعلیٰ کردار اور مذہبی انسان تھا اس لیے اپنے دور حکومت میں اس نے نہ صرف نشہ آور اشیا پر پابندی لگادی، شعر و سخن اور رقص و سرور کی محفلوں کو موتوف کر دیا بلکہ بسنت، مرگ اور عید میلاد کے عوامی جشن بھی برخاست کر دیے تھے۔ سلطان عبداللہ نے اپنے دور حکم رانی میں، محمد قلی قطب شاہ کی قائم کردہ تمام سماجی، ادبی اور تہذیبی روایات کو از سر نو جلا بخشی۔ وہ شاعر اور فن کار جو سلطان محمد کے دور میں دل گیر اور مایوس ہوکر گوشہ۔ نشین ہو گئے تھے۔ ان کو دوبارہ اپنی فن کارنہ صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا۔ محمد قلی قطب شاہ کا ملک الشعرا۔ وجہی جو سلطان محمد کے دور حکومت میں گم نامی اور مفلسی کی زندگی گزار رہا تھا، عبداللہ قطب شاہ نے اسے دوبارہ دربار شاہی میں شرف باریابی بخشا۔ جس کا تذکرہ وجہی نے "سب رس" میں اس طرح کیا ہے:

صباح کے وقت، بیٹھے تخت، یکایک غیب تے رمز پاکر، دل میں اپنے
کچ یاکر، وجہی نادر فن کوں، دریا دل گوہر سخن کوں، حضور بلائے
پان دیے بھوت مان دیے، ہور فرمائے کہ انسان کے وجود بیچ میں کچھ
عشق کا بیان کرنا، اپنا ناؤں عیاں کرنا کچھ نشان دھرنا، وجہی بہو گن
گن بھریا، تسلیم کر کر سر پر ہات دھریا۔" (۴)

عبداللہ قطب شاہ اور اس کے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طبیعت اور مزاج میں غیر معمولی مماثلت نظر آتی ہے دونوں نہ صرف یہ کہ خوش گو شاعر، علوم و فنون کے رسیا، پری جمالوں کی صحبت میں شغل ساغر و جام اور بزم ہائے رقص و سرود منعقد کرنے کے عادی تھے بلکہ شاعروں، ادیبوں اور اہل کمال کی دل کھول کر سرپرستی بھی

کرتے تھے۔ طبیعت اور مزاج کی اسی مناسبت کی وجہ سے عبداللہ قطب شا کے عہد میں تمدنی اور ثقافتی نقطہ نظر سے، گولکنڈے میں وہی ماحول پیدا ہوگیا تھا جیسا کہ محمد قلی قطب شاہ کے دور میں موجود تھا۔ غواصی نے "طوطی نامہ" میں اور مقیمی نے "چندر بدن و مہیار" میں لکھا ہے کہ عبداللہ کے روپ میں محمد قلی قطب شاہ نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ غواصی کے اشعار ہیں:

مہاراج سلطان عبداللہ ناؤں ثریا کے تارک پو اس کا پاؤں
دیکھت زور ورطالع اس راج کے صفادار روشن دلاں آج کے
کہیں یوں بحق علی ولی کہ پھر جگ میں آیا محمد قلی
دیا جیو پھر راگ ہور رنگ کوں کیا دور سینیاں پو کے زنگ کوں
بدیاونت ملکے ملک کے تمام ترے شہر میں آکیے سب مقام

مقیمی کہتا ہے:

مقیمی توں کر صفت شہ کا اتا جنے تجھ کوں روشن کیا ہے یتا
جو سلطان عبدالہ ہے شہہ گنبھیر قمر شمس تے اس کا روشن ضمیر
کہ عدل ہور انصاف ہور داد کا او ہے بادشاہ حیدرآباد کا
دکھن کے شہاں میں گرامی ہے او گرامی اہے ہور نامی ہے او
دکھن کے شہاں دیکھ پھر یوں کہے محمد قلی پھر کو آیا اہے

سلطان عبداللہ کو محمد قلی قطب شاہ کی طرح مذہبی اور غیر مذہبی تقاریب اور تہواروں سے غیر معمولی دل چسپی تھی۔ ان تقاریب کے موقع پر زر کثیر خرچ کر کے جشن کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ مذہبی تقاریب میں عید مولود نبی محرم اور غیر مذہبی تقاریب میں بسنت اور مرگ کے تہوار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عید میلاد کا جشن "داد محل کے میدان میں منعقد ہوتا تھا، جہاں یکم ربیع لاول سے بارہ دن تک دمامہ، نقارہ اور نوبت بجتی۔ داد محل کے میدان کو خوب صورت خیموں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ رات میں آتش بازی اور چراغاں کا اہتمام کیا جاتا۔ اس موقع پر ماہر فن موسیقار، مغنی اور رقاص اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ عبداللہ قطب شاہ کو حضور اکرمؐ کی ذات اقدس سے بے پناہ عقیدت تھی۔ محمد قلی کی طرح اس کی غزل کا ہر مقطع "نبی صدقے" سے شروع

ہوتا ہے۔اس کے کلیات میں عید میلاد کے موضوع پر چار نعتیہ غزلیں بھی موجود ہیں۔
چند شعر دیکھیے:

نبی مصطفیٰ کا جو مولود آیا ‏ جہاں صاف ہو سر بسر جگمگایا
خوشیاں کے کھلے پھول بن یک طرف تھے ‏ زمیں شاد ہوی ہور گگن ذوق پایا
محمدؐ کے صدقے تھے سب دور کر غم ‏ عجب کچ خوشی مُنج الہیٰ دلایا
لکھ فیض سوں پھر آیا دن دین محمدؐ کا ‏ آفاق صفا پایا دن دین محمدؐ کا
اسلام کرا تارا آیا جو نکل بھارا ‏ چھپ کفر گیا سارا دن دین محمدؐ کا
یو عید ہمن ساجے نصرت کے بجے باجے ‏ ہے جگ کے نبی راجے دن دین محمدؐ کا
روشن ہوئے اسماناں جھمکائے رتن کھاناں ‏ حظ لیوے مسلماناں دن دین محمدؐ کا

عبداللہ قطب شاہ کی زندگی کا بیشتر حصہ اگرچہ عیش و عشرت میں گزرا لیکن محرم کا چاند دیکھتے ہی وہ ساغر و جام کو خیرباد کہہ کر سیاہ ماتمی لباس زیب تن کر کے پاپیادہ عاشور خانوں کا رخ کرتا تھا۔" حدیقتہ السلاطین " کے مولف نے لکھا ہے کہ قطب شاہی سلاطین عشرہ۔ محرم میں لباس شاہی کو جامہ۔ عزا سے تبدیل کر دیتے تھے۔ گانے بجانے والے اپنے تمام آلات موسیقی غلافوں میں رکھ دیتے ۔ شاہی اور عام باورچی خانوں میں گوشت کی آمد بند ہو جاتی اور نشہ آور چیزوں کی دکانیں بند ہو جاتیں "(۹)

غیر مذہبی تہواروں میں بسنت اور آمد برسات کے جشن گولکنڈے کے پر فضا مقامات پر بڑے دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کے دیوان میں بسنت کے موضوع پر تین اور " مرگ " کے موضوع پر ایک غزل موجود ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رنگ بھریا مُنج گھر میں آج آیا بسنت ‏ غیب تھے تازہ طرب لیایا بسنت
جیوں ابھال یک دھر تھے چھا آفاق پر ‏ رنگ کا برسات برسایا بسنت
رنگ بھریاں کی بزم کو بہور نگ سوں ‏ کر بہارستان دکھلایا بسنت
لاصراحی کو پیالے سوں گلے ‏ سرخوشی کا کام فرمایا بست

مرگ گرجیا ، سہیلیاں ہو، الاپو راگ ملہارا
کہ خوش موتیاں کے ہاراں ہو برستے میگھ کے دھارا
جھمکتاں بجلیاں گھن کیاں اتم پتلیاں ہوں کندن کیاں
کہکتیاں کوئلاں بن کیاں بتا ہنگام کا بارا
ہری ہو دھرتی ساری دسے پاچاں میں جیوں ناری
صفا سے چرخ رنگاری کھلیا جوں پھول ہر تارا

دیگر قطب شاہی سلاطین کی طرح عبداللہ قطب شاہ نے بھی متعدد باغ اور عمارتیں بنوائی تھیں (۱۲) نظام الدین احمد نے "حدیقۃ السلاطین" میں ایک عالی شان چار منزلہ محل کا تذکرہ کیا ہے، جس کی تعمیر میں ہاتھی دانت اور صندل کی لکڑی استعمال کی گئی تھی اور اندرونی دیواروں پر رنگ کا کام کیا گیا تھا۔ مورخین نے اس محل کا نام نہیں بتایا البتہ خود عبداللہ قطب شا نے اس محل کا نام "عشرت محل" بتاتے ہوئے اس کی تعریف و توصیف میں سات اشعار پر مشتمل ایک مربوط غزل لکھی ہے۔ اس محل کے خوب صورت طاق اور نقش و نگار سے مزین در و دیوار کی مدح سرائی کرتے ہوئے سلطان عبداللہ نے اسے دکن کی آنکھوں کی پتلی اور ایک نو شگفتہ پھول کہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ روئے زمین پر ایسا شان دار محل جمشید و دارا نے بھی نہیں بنوایا:

یو دل کشا عشرت محل مطبوع اوتارا ہوا
جوتی زمیں کی پیٹھ پر جیوں مشتری تارا ہوا
ہر طاق یاں خوش طرح کا دستا دریچہ فرح کا
عاجز ہوں اس کی شرح کا حیران سنسارا ہوا
انکھیاں سو چندر سور کے دیکھ آسمان دور کے
عاشق ہیں اس کے نور کے کیا خوب یو ٹھارا ہوا
دیویں صفا دیوار سو لک نقش ٹھارے ٹھار سو
خوش مان یاں عطار سو فردوس کا بارا ہوا
نازک اچنبا بے بدل لکھن بھریا ایسا محل

باندیا نہ کوئی آخر اول جمشید یا دارا ہوا
جیوں پھول تازہ بن منے جوں پوتلی لوچن منے
تیوں آج اس دکھن منے یو محل اتم سارا ہوا
صدقے بنی کے پااماں اس محل میا تے ہر زماں
جم عبدلا شہ ترکماں بھوگی گمن ہارا ہوا

عبداللہ قطب شاہ کا مکمل دیوان ہنوز دریافت نہیں ہوا۔ اس کے مطبوعہ کلیات میں ردیف "ش" تک جملہ ۹۷ غزلیں اور ایک مرثیہ ہے۔ قدیم دکنی کے دوسرے شعرا کی طرح عبداللہ قطب شاہ کا کلام بھی ہندستانی تہذیب و تمدن، مقامی ماحول اور طرز معاشرت کی ترجمانی کرتا ہے۔ شاعری کے پہلو بہ پہلو عبداللہ قطب شاہ کو فن موسیقی سے بھی غیر معمولی لگاؤ تھا۔ ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ اس نے ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کی "کتاب نورس" کے جواب میں موسیقی کے موضوع پر ایک منظوم کتاب بھی لکھی تھی۔ (۱۵) اس لیے اس کی غزلوں میں مختلف راگ راگنیوں کے علاوہ آلات موسیقی جیسے سرمنڈل، چنگ ورباب، جنتر، طنبورا، دوتارا وغیرہ کا جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ نغمگی اور موسیقیت سلطان عبداللہ کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ہم قافیہ الفاظ کی تکرار سے اس نے اپنے کلام میں ترنم اور موسیقی کا جادو جگایا ہے۔ متعدد غزلوں میں اس نے چار چار یا اس سے زائد قافیوں کا استعمال کر کے ایک لے اور جھنکار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

پیالے پیالے پیالے یو پینا
دنیا میں دنیا میں یہی کچھ ہے جینا
رین جاتی نہ نیند آتی، لگا چھاتی مجہ اے ساقی
کہ کہواتی ہوں رنگ راتی ہوں میں ماتی تری لالہ
چندر کلا، ترا گلا ہے نرملا اچھلا
سو منج بھلا کے بسلا، کیا گلہ، وہ نرملا
نین میں لاتو کاجلا یتا بلا نکو گھلا
لٹ اچپلا، ہلوں ہلا، کہ چلبلا، ہے وہ بلا

مرادلا ، ہے باوَلا ، الابلا منجے بلا
جو مدپلا ، تجے گلا لیووں بھلا ، کے چنچلا

عبداللہ قطب شاہ کے دور کا کوئی ادبی جائزہ مکمل نہیں ہو سکتا اگر اس میں ملک الشعرا ملا غواصی کا ذکر شامل نہ ہو۔ غواصی دکنی اردو کا ایک نام ور اور عظیم المرتبت شاعر ہے۔ اس نے مثنوی، غزل، قصیدہ اور رباعی کی صنف میں اپنی بے پناہ فن کارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن بہ حیثیت مثنوی نگار اور غزل گو وہ قدیم اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار پاتا ہے۔ اس میدان میں دبستانِ دکن کا کوئی شاعر اس کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔ اس کی تینوں مثنویاں (میناست ونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال۔ طوطی نامہ) دکنی کی بلند پایہ اور شاہکار مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے بقول پروفیسر غلام عمر خاں:

> "تغزل و سرمستی، جذبات کا سوز و گداز، زبان و بیان کی بے ساختگی اور لطافت اور شگفتگی، اشعار کی نغمگی و موسیقیت یہ وہ خصوصیات ہیں جہاں غواصی دور حاضر کے مقبول متغزلیں، حسرت اور جگر کے مقابلے میں بھی منفرد نظر آتا ہے۔ اس کی بعض غزلیں جو علوے جذبات، بلند آہنگی، کیف و مستی، سرخوشی و سرشاری اور شعور ذات کی رفیع جمالیاتی کیفیات کی عکاسی کرتی ہیں، حافظ و خسرو کی اسی رنگ و آہنگ کی غزلوں کی ہم پایہ ہیں۔" (۱۸)

حوالے:

(۱) کلیات غواصی ص ۱۹۳

(۲) تاریخ دکن۔ اختر یبنانی و فصاحت جنگ جلیل۔ حیدرآباد ۱۳۲۸ھ ص ۳۳۶

(۳) عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ ص ۳۵۹

(۴) سب رس۔ وجہی مرتبہ: مولوی عبدالحق۔ ۱۹۳۲ء بلوچستان ص ۷

(۵) "طوطی نامہ"

(۶) ڈاکٹر زور تذکرۂ مخطوطات جلد پنجم ص ۴۸،

(۷) کلیات عبداللہ ص ۶۷

(۸) دیوان عبداللہ قطب شاہ ص ۷

(۹) حدیقۃ السلاطین

(۱۰) دیوان عبداللہ قطب شاہ ص ۱۱۲

(۱۱) دیوان عبداللہ قطب شاہ ص ۴۰

(۱۲) تاریخ گولکنڈہ ص ۴۲۱

(۱۳) حدیقۃ السلاطین ص ۸۸

(۱۴) دیوان عبداللہ قطب شاہ ص ۶۵

(۱۵) دکنی ادب کی تاریخ ص ۷۰

(۱۶) "دیوان عبداللہ قطب شاہ" ص ۵۰

(۱۷) "دیوان عبداللہ قطب شاہ" ص ۱۷

(۱۸) مجلہ۔ تحقیقات اردو۔ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ۔ ۱۹۸۰۔ ص ۱۱



عادل شاہی سلاطین کے ادبی اور تہذیبی کارنامے

پندھرویں صدی کے اواخر میں بہمنی سلطنت کا چراغ بجھتے بجھتے دکن کے علاقے پر پانچ نئے چراغ روشن کر گیا۔ جناں چہ اس سلطنت کے زوال کے بعد یہاں پانچ خود مختار سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ گولکنڈے میں جو دکن کا جنوب مشرقی صوبہ تھا قطب شاہی (۱۵۱۸ء۔ ۱۶۸۶ء) بیجاپور میں، جو اس کا شمال مغربی صوبہ تھا قطب شاہی (۱۴۹۰ء۔ ۱۶۸۵ء) احمد نگر میں، جو اس کا شمالی صوبہ تھا، نظام شاہی (۱۴۹۰ء۔ ۱۶۳۳ء) برار میں جو اس کا سرحدی صوبہ تھا، عماد شاہی (۱۴۸۷ء۔ ۱۵۷۴ء) اور خود بیدر میں برید شاہی (۱۴۸۷ء۔ ۱۶۱۹ء) سلطنت قائم ہوئی (۱)۔

بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین کو دکن کی سیاسی، سماجی، ادبی اور تہذیبی تاریخ میں ایک نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے تاریخ دکن میں تہذیبی اور ادبی نقطہ نظر سے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اس خاندان کے تمام حکم ران صاحب سیف و قلم تھے۔ وہ نہ صرف میدان کارزار کے سورما تھے بلکہ علم و ادب اور شعر و سخن کے دل دادہ بھی تھے۔ یوسف عادل شاہ سے سکندر عادل شاہ تک، اس خاندان کے نو حکم رانوں نے کم و بیش دو سو سال تک بیجاپور پر حکم رانی کی۔

عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ ہے جس نے ۸۹۷ھ / ۱۴۹۰ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ دراصل سلاطین عثمانیہ کا شہزادہ تھا اور محمد شاہ بہمنی (۱۴۶۲ء۔ ۱۴۸۲ء) کے دور حکومت میں ایران سے ہوتا ہوا دکن پہنچا تھا جہاں محمود گاواں (متوفی ۱۴۸۹ء) کے زیر ترتیب وہ ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے ۱۴۸۵ء میں بہمنی سلطنت کے صوبہ بیجاپور کا حاکم بن گیا (۲)۔ یوسف عادل شاہ کا زیادہ تر وقت اگر چہ کہ سلطنت کے استحکام میں گزرا لیکن اس کے باوجود اس نے شاعروں، ادیبوں اور اہل کمال کی سرپرستی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یوسف عادل شاہ نہ صرف فنون لطیفہ کا اچھا مذاق رکھتا تھا بلکہ خود بھی فارسی زبان میں شعر کہتا تھا (۳)۔ اور

اساتذہ کے کلام سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ طبلہ، طنبورہ۔ ستار اور عود خوب بجاتا تھا۔ علم عروض و قافیہ، خطاطی اور موسیقی میں بھی اسے کمال حاصل تھا، علما، فضلا اور ارباب ہنر کا بڑا قدر دان تھا۔ ایران، عرب، روم اور دور دراز مقامات سے "استمالت نامے" بھیج کر اہل ہنر حضرات کو بلاتا اور ان کی اس قدر قدر و منزلت کرتا کہ وہ یہیں کے ہو رہتے (۴)۔ اس عہد کے علما و فضلا میں حاجی رومی، شیخ نصیر الدین، علامہ نصر اللہ ولی، پیر جمنا، حضرت پیر مقصود وغیرہ قابل ذکر ہیں (۵)۔ یوسف عادل شاہ نے کئی قلعے اور خوب صورت عمارتیں بنوا کر شہر بیجاپور کی زینت بڑھائی۔ اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں فرخ محل اور آنند محل کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں (۶)۔

یوسف عادل شاہ کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ (۱۵۱۰ء۔ ۱۵۳۴ء) بیجاپور کے تخت کا وارث بنا۔ وہ اپنے باپ کی طرح ایک ادب نواز اور رعایا پرور حکم ران تھا۔ اس کو بھی فنون لطیفہ سے خاص لگاؤ تھا۔ فارسی میں شعر کہتا تھا۔ وفائی اس کا تخلص تھا (۷)۔ نقاشی اور موسیقی میں بھی اس کو مہارت حاصل تھی۔ زبیری اور فرشتہ نے اسمعیل کی سخن سنجی اور علم دوستی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اسمعیل عادل شاہ کو فارسی اور ترکی سے غیر معمولی دل چسپی تھی اور اس کے پہلو بہ پہلو وہ مقامی تہذیب و تمدن سے بھی متاثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے ایک شہر کا نام چندا پور اور ایک محل کا نام چمپا محل رکھا (۸)۔

اسمٰعیل کی وفات کے بعد اس کا فرزند ابراہیم عادل شاہ (۱۵۳۴ء۔ ۱۵۵۷ء) بیجاپور کے تیسرے حکم ران کی حیثیت سے بادشاہ بنا۔ وہ بھی اپنے آبا و اجداد کی طرح ذوق علم و ادب سے بہرہ مند تھا۔ غالباً وہ خود شاعر نہیں تھا لیکن شاعروں، عالموں اور اہل فن کا بڑا قدر دان تھا، مورخین نے اس کے علم و فضل اور اہل علم و ہنر کی سرپرستی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کے عہد کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مملکت کے سرکاری دفتروں میں فارسی زبان کے بجائے اردو کو رائج کیا (۹)۔ ابراہیم اگرچہ کہ ایک تند مزاج بادشاہ تھا لیکن علما و فضلا کی بڑی تعظیم کرتا تھا۔ خواجہ معین الدین، آقا شہاب الدین، خواجہ عنایت اللہ شیرازی، ملا فتح اللہ شیرازی جیسے علما اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ قدیم اردو کے مشہور شاعر اور اپنے زمانے کے سربرآوردہ

مذہبی رہنما حضرت میراں جی شمس العشاق بھی ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور میں موجود تھے (۱۰)۔

ابراہیم عادل شاہ کا فرزند علی عادل شاہ (۱۵۵۷ء – ۱۵۸۰ء) بڑا اولوالعزم اور صاحب تدبیر حکمراں تھا۔ اس کے عہد میں علم و فن اور شعر و سخن کو بہت ترقی ہوئی۔ علی عادل شاہ شعرا اور اہل علم کی سرپرستی میں اپنے اجداد سے بھی آگے تھا۔ اس کے دور حکومت میں فارس، عراق، عرب، آذر بائیجان اور کئی ملکوں سے اہل علم آکر بیجاپور میں جمع ہوگئے تھے (۱۱)۔ اس کے ذوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ وہ سفر میں بھی کتابوں کے صندوق اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں رفاہ عام کے بہت کام ہوئے۔ اس نے کئی مسجدیں، قلعے اور محلات تعمیر کروائے جن میں مسجد غالب، گگن محل، ہریا محل اور چاند باولی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ علی عادل شاہ کے عہد میں تجارت کو بھی کافی فروغ ہوا، شاہ پور جس کو خود بادشاہ نے بسایا تھا بہت بڑی تجارتی منڈی بن گیا۔ اس عہد کے سب سے سربرآوردہ بزرگ حضرت برہان الدین جانم تھے، جنھوں نے اپنے والد شمس العشاق کی طرح اپنے مریدوں اور معتقدین کی تعلیم و تفہیم کے لیے دکنی نظم و نثر میں متعدد رسالے لکھے (۱۲)۔

علی عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء – ۱۶۲۶ء) بیجاپور کے تخت کا وارث بنا، ابراہیم ثانی نہ صرف یہ کہ عالموں، شاعروں اور اہل کمال کا قدردان تھا بلکہ خود بھی صاحب علم و فضل تھا۔ خطاطی، مصوری، نقاشی، شاعری اور موسیقی میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ شاعری اور موسیقی کا ذوق اسے ورثے میں ملا تھا، ان دونوں فنون میں اس کو استادانہ مہارت حاصل تھی، اسی وجہ سے اس کو "جگت گرو" کہا جاتا تھا۔ "کتاب نورس" ابراہیم کا سب سے اہم کارنامہ ہے جس کا مقدمہ ملا ظہوری نے لکھا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ابراہیم کے شاعرانہ کمال اور موسیقی سے غیر معمولی دل چسپی، ہندو دیو مالا، سنسکرت، برج بھاشا اور دکنی سے گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے عہد میں دکنی شعرا کو کافی عروج حاصل ہوا۔ اس عہد کے دکنی شعرا میں عبدل اور مقیمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی محمد قلی قطب شاہ اور اکبر اعظم کا ہم عصر تھا، اس میں بھی وہ تمام اوصاف بدرجہ کمال

موجود تھے جن کی بدولت اکبر اور محمد قلی مشہور ہوئے۔ اس کے عہد میں بیجاپور عالموں، شاعروں، موسیقاروں اور ماہرین تعمیر کا مرکز بن گیا تھا۔ ایران کے علما و فضلا کے علاوہ احمد نگر، گجرات اور بنارس کے اہل علم بھی اس کے دربار سے وابستہ تھے (۱۳)۔ اس عہد کے نامور علما و فضلا میں علامہ نور الدین ظہوری، مولانا ملک قمی، شیخ علم اللہ، ملا رفیع الدین شیرازی، مورخ محمد ابو القاسم فرشتہ، حکیم آتشی اور عبد الرشید قابل ذکر ہیں۔ ابراہیم ثانی ہندستانیت کا بہت بڑا پرستار تھا۔ علوم مروجہ کے علاوہ شاعری اور موسیقی پر اسے مہارت حاصل تھی۔ "کتاب نورس" مختلف راگ راگنیوں" کے مطابق ترتیب دیے گئے گیتوں کا مجموعہ ہے بقول ڈاکٹر جمیل جالبی "کتاب نورس" گیتوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان گیتوں میں حسن و جمال کی رعنائیوں، تخیل کی سحر انگیز نگینیوں، عشق کی دبی دبی آگ پر اثر تشبیہات اور ہجر و وصال کی رنگا رنگ کیفیات کا خوب صورت اظہار ملتا ہے" (۱۴)۔ اسی دور میں عبدل نے بادشاہ وقت کی ذات و صفات کے موضوع پر "ابراہیم نامہ" کے نام سے ایک کتاب ۱۶۰۳ء میں قلم بند کی۔ اس مثنوی کے مطالعے سے جہاں ایک طرف بادشاہ وقت کے واقعات حیات پر روشنی پڑتی ہے تو وہیں دوسری طرف اس دور کی تہذیب و معاشرت عمارت و آرائش، لباس و زیورات اور نشست و برخاست کی بولتی ہوئی تصویریں بھی سامنے آجاتی ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے محمد عادل شاہ (۱۶۲۶ء۔ ۱۶۵۶ء) نے اپنے باپ کی قائم کردہ روایات کو برقرار رکھا۔ غالباً وہ خود شاعر نہیں تھا لیکن علم و ادب اور اہل فن کی قدر دانی میں اپنے اجداد سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا۔ حکیم آتشی نے اسی کے ایما پر خمسہ۔ نظامی کا جواب لکھا۔ ملا محمد حسن نے ملا رفیع الدین شیرازی کی تاریخ کا تکملہ کیا اور ملک خوش نود نے "ہشت بہشت" لکھی۔ اس کی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو جو محمد قطب شاہ کی دختر اور عبد اللہ قطب شاہ کی بہن تھی، اپنے ساتھ گولکنڈہ کی ان علمی و ادبی اور تہذیبی روایات کو لائی تھی جن کو ابراہیم قلی، محمد قلی، قطب شاہ اور عبد اللہ قطب شاہ نے فروغ دیا تھا۔ خدیجہ سلطان کی ایما پر ہی کمال خاں رستمی اور ملک خوش نود کی شاہکار مثنویاں (۱۵) منظر عام پر آئیں۔ اس عہد کے

اردو شاعروں میں رستمی اور خوشنود کے علاوہ صنعتی، دولت، قطب رازی، امین، ظہور ابن ظہوری اور حسن شوقی کے نام قابل ذکر ہیں۔

سلطان محمد عادل کی وفات کے بعد اس کا کلوتا بیٹا علی عادل شاہ ثانی (۱۶۵۶ء۔ ۱۶۷۳ء) مملکت بیجاپور کے آٹھویں بادشاہ کی حیثیت سے تخت نشین ہوا۔ وہ ایک معمولی عورت کے بطن سے تولد ہوا تھا لیکن اس کی پرورش خدیجہ سلطان شہر بانو جو سلطان محمد کی اہلیہ، محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی اور محمد قطب شاہ کی بہن تھی، کی گود میں ہوئی۔ دیگر عادل شاہی سلاطین کی طرح وہ ایک علم دوست اور ادب نواز بادشاہ تھا۔ اس کو شاعری، موسیقی اور فن تعمیر سے غیر معمولی دل چسپی تھی۔ شاہی قدیم اردو کا ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کے کلیات میں ۲۰/ غزلیں، ۶/ قصائد، ۱۶/ مرثیے، ۳/ مختصر مثنویاں، ایک مخمس، ایک مثمن، ایک قطعہ، ایک رباعی، ایک پہیلی اور ۳/ اادیات موجود ہیں۔ وہ "نورس" کے ڈھنگ کے راگ اور گیت لکھنے پر بھی قدرت رکھتا تھا۔ شاہی کی بنائی ہوئی تاریخی عمارتوں میں حسینی محل، بادشاہ محل، جامع مسجد، حسینی مسجد، عرش محل اور اور علی داد محل قابل ذکر ہیں (۱۶)۔ اس کے دربار سے سید نور اللہ، سید کریم اللہ، عبد الطیف اور عبد النبی جیسے فارسی کے عالم و شاعر اور ملک الشعرا ملا نصرتی (۱۷)، حضرت امین الدین اعلیٰ، ہاشمی اور مرزا جیسے قدیم اردو کے بلند پایہ سخن ور وابستہ تھے۔

عادل شاہی حکومت کے آخری تاج دار سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳/ ۱۶۷۲ء۔ ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۸۶ء) کا عہد اندرونی اور بیرونی خلفشار کی وجہ سے اضطراب اور بے چینی کا زمانہ تھا۔ شیواجی اور اورنگ زیب کے حملوں کی وجہ سے سلطنت بیجاپور کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ آخر کار ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے بیجاپور کو فتح کر کے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا لیکن ایسے زمانے میں بھی علم و فن، تہذیب و شائستگی اور شعر و سخن کا چراغ برابر جلتا رہا۔ سکندر عادل شاہ کے عہد کے اردو کے شاعروں اور عالموں میں ابو المعالی، ملا عبد الرب، عبد القادر، عبد الطیف، عبد الغنی، سیوا، مومن، اور معظم کے نام قابل ذکر ہیں۔

سلاطین عادل شاہی سخاوت، فیاضی اور دریا دلی میں اپنا جواب آپ تھے۔ وہ

غریب رعایا کی پرورش اور اہل فن کی سرپرستی میں روپیہ پانی کی طرح خرچ کرتے تھے۔ سرکار کی جانب سے تعلیم کا مفت انتظام تھا۔ طلبا کو کھانے، پینے اور رہنے کی سہولتوں کے علاوہ کتابوں کی خریدی اور دیگر اخراجات کے لیے وظائف مقرر تھے۔ عادل شاہوں نے رفاہِ عام کے کاموں پر بھی بطور خاص توجہ کی۔ سڑکوں اور نہروں کے علاوہ جگہ جگہ کاروان سرائیں اور لنگر خانے تعمیر کیے گئے تھے، جہاں مسافروں اور محتاجوں کو پکی ہوئی غذا مہیا کی جاتی تھی۔ مشائقین اور علما کو وظائف اور یومیے دیے جاتے تھے۔ ہندوؤں کے مذہبی رسومات اور مندروں کی نگہہ داشت کے لیے جاگیریں دی جاتی تھیں۔ سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کا عنصر غالب رکھا گیا تھا۔ عادل شاہی عہد میں عیدیں اور سال گرہ کی تقاریب بڑے اہتمام سے منائی جاتی تھیں۔ شاہی عمارتوں پر روشنی کی جاتی، غریبوں کو عمدہ کھانا کھلایا جاتا اور کپڑے بھی تقسیم کیے جاتے (۱۸)

عادل شاہی سلاطین کے دور حکومت میں دکنی شعرو ادب کی نشو ونما کا جائزہ لینے کے لیے ایک علاحدہ باب درکار ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس دور کے شعرو ادب اور دیگر علوم و فنون پر روشنی ڈالتے ہوئے " تاریخِ ادب اردو " میں لکھا ہے " عادل شاہی دور کی تخلیقی سرگرمیوں میں فن تعمیر، خطاطی اور شعرو شاعری کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ادب میں تاریخی اور مذہبی موضوعات بھی شامل تھے لیکن سب سے زیادہ اہمیت شاعری کو حاصل تھی، شاعری ہر قسم کے خیالات، خواہ وہ عاشقانہ و ناصحانہ ہوں یا صوفیانہ و رزمیہ ہوں اظہار کا سب سے مقبول وسیلہ تھی۔ یہ معاشرہ شاعری کو ایک ایسا فن سمجھتا تھا جس سے آدمی کا نام ہمیشہ باقی رہتا ہے۔۔۔۔ اس رجحان نے شاعری کے باغ میں رنگا رنگ پھول کھلائے اب تک شاعری صرف و محض مقصد کا اظہار تھی لیکن اس دور میں شاعری کی اپنی الگ اہمیت و حیثیت قائم ہو گی۔ اب شاعری صرف تک بندی نہیں بلکہ اس میں احساس، جذبہ، تخیل، محاکات اور شعریت کی اہمیت ہو گئی تھی۔ اس دور میں تخلیقی عمل اپنا رنگ جمانے لگتا ہے اور شاعری اپنے دامن میں ہر قسم کے موضوعات سمیٹنے لگتی ہے۔" (۱۹)

عادل شاہوں نے صوبہ۔ بیجاپور کو جو بہمنی عہد میں ایک فوجی چھاؤنی سے

زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا، ایک خوب صورت اور بارونق شہر بنادیا، شاہی محلات کے علاوہ امرا کی دیوڑھیاں بھی شان دار تھیں۔ ان عمارتوں کو طرح طرح کی شان دار آرائشی اشیا اور قیمتی فرش سے سجایا جاتا تھا۔ عادل شاہوں کے بنوائے ہوئے قلعے، مساجد، فصیلیں، برج، تالاب، نہریں، باؤلیاں، حوض، محلات اور بزرگان دین کے مقبرے آج بھی دیکھنے والوں کو دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔ ان عمارتوں میں سے بعض صدیاں گزرنے کے باوجود اچھی حالت میں ہیں جیسے گول گنبد، ایک مینار کی مسجد، جامع مسجد، آنڈو مسجد، آثار محل، مہتر محل، ملکہ جہاں بیگم کی مسجد، حیدر برج، روضہ ناتمام سلطان علی عادل شاہ شاہی، ابراہیم روضہ۔ آنند محل، گگن محل، سات منزلی، مبارک محل اور بزرگان دین کے مقبروں میں حضرت امین الدین اعلیٰ کا مقبرہ، روضہ مولانا گنج العلم، مقبرۂ عین الملک اور مقبرہ تاج جہاں بیگم وغیرہ۔ بقول پروفیسر غلام عمر خاں "جہاں تک شعر و ادب کی نشو و نما کا تعلق ہے گولکنڈہ اور بیجاپور دونوں دبستانوں کی اہمیت یکساں ہے لیکن فنون لطیفہ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بیجاپور کا پلہ بھاری ہے۔ آج بھی بیجاپور کی بنجر سرزمین میں فن تعمیر کے جمیل و جلیل شاہکار اپنے صناعوں کی عظمت رفت کی یاد دلاتے ہیں۔" (۱۹)

حوالے و حواشی:

(۱) عبدالمجید صدیقی - مقدمہ۔ تاریخ دکن (۱۹۴۰ء) ص ۱۸-

(۲) ڈاکٹر جمیل جالبی - تاریخ ادب اردو (جلد اول) ص ۱۸۳-

(۳) بشیر الدین احمد - واقعات مملکت بیجاپور - ص ۳۷-

(۴) ابوالقاسم فرشتہ - تاریخ فرشتہ (جلد دوم) ص ۲۲-۲۳-

(۵) پروفیسر سروری - اردو کی ادبی تاریخ - (۱۹۵۸ء) ص ۸۲-

(۶) پروفیسر سروری - اردو کی ادبی تاریخ - (۱۹۵۸ء) ص ۸۲-

(۷) بشیر الدین احمد - واقعات مملکت بیجاپور - ص ۱۷-

(۸) پروفیسر سروری - اردو کی ادبی تاریخ - ص ۸۴-

(۹) پروفیسر سروری - اردو کی ادبی تاریخ - ص ۸۴-

(۱۰) پروفیسر سروری - اردو کی ادبی تاریخ - ص ۸۴-

پروفیسر سروری - اردو کی ادبی تاریخ - ص ۸۴ -
پروفیسر سروری - اردو کی ادبی تاریخ - ص ۸۶ -
ڈاکٹر نذیر احمد - تحقیقی مقالے - ص ۱۲۴ -
ڈاکٹر جمیل جالبی - تاریخ ادب اردو (جلد ۱) ص ۲۱۵ -
"خاور نامہ" (۱۶۴۰ء) اور "جنت سنگار" (۱۶۴۰ء)
پروفیسر سروری - اردو کی ادبی تاریخ - ص ۹۲ -

نصرتی (متوفی ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء) عادل شاہی دور کا سب سے بڑا شاعر ہے - وہ شاہی کا دربار میں شاعر تھا - اور اس نے "گلشن عشق" "علی نامہ" اور "تاریخ اسکندری" کے نام سے تین بلند پایہ مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہے - قصیدہ نگاری کے میدان میں وہ نہ صرف دکنی اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے بلکہ سودا کا مد مقابل بھی ہے - ڈاکٹر جمیل جالبی نے نصرتی کی غزلوں قصیدوں رباعیوں اور دیگر اصناف شاعری پر مشتمل ایک دیوان انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع کیا ہے -

بشیر الدین احمد - واقعات مملکت بیجاپور - ص ۲۷۲ -
محمد علی اثر - دبستان گولکنڈہ - ادب اور کلچر ص ۸ -

ادبی تحقیق کے مسائل۔ دکنی ادب کے حوالے سے

لفظ تحقیق عربی زبان کے لفظ " حق " سے بنا ہے، جسے لغت نگاروں نے، کھوج، پرکھ اور چھان بین کا مترادف قرار دیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تحقیق، سچائی کی تلاش، اصلیت کی دریافت اور حقیقت کی بازیافت کا نام ہے۔ جہاں تک اس لفظ کے اصطلاحی معنی کا تعلق ہے، تحقیق سے مراد تلاش و جستجو کے ذریعے حقائق کا انکشاف اور ان کی تصدیق ہے۔

مختلف محققین نے تحقیق کے کم و بیش اسی مفہوم کی وضاحت اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ چنانچہ عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں " تحقیق نامعلوم حقائق کی تلاش اور معلوم حقائق کی توسیع یا ان کی خامیوں کی تصدیق کا نام ہے "(۱)۔

ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں " تحقیق کے لغوی معنی کسی شئے کی " حقیقت " کا اثبات ہے، اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں " موجود مواد " کے صحیح اور غلط کو مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے "(۲)۔

قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ " تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ کوشش کا لفظ ارادتاً مستعمل ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دیکھنا اور دیکھنے کی کوشش ایک نہیں۔ کوشش کامیاب بھی ہوتی ہے اور ناکام بھی۔ ناکامی کبھی جزوی ہوتی ہے اور کبھی کلی "(۳)۔

رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ " حقائق کی بازیافت، صداقت کی تلاش، حقائق کا تعین اور ان سے نتائج کا استخراج، ادبی تحقیق کا مقصود ہے یا ہونا چاہیے "

پروفیسر گیان چند اردو، انگریزی اور ہندی میں تحقیق کی اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " اردو اصطلاح تحقیق کے معنی سچ یا حقیقت کی دریافت ہے۔ انگریزی اصطلاح ری سرچ کے معنی ہیں کھوج اور دوبارہ کھوج، ہندی اصطلاح انوسندھان کے معنی کسی مقررہ نشانے کو حاصل کرنے کے لیے اس کا تعاقب کرنا

ہے"(۵)۔

ادبی تحقیق ایک دشوار گزار اور صبر آزما کام ہے۔ تن آسانی اور جلد بازی محقق کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھی ہے کیوں کہ عجلت پسندی کی وجہ سے اکثر وبیش تر غلط اور گمراہ کن نتائج سامنے آتے ہیں۔ ایک اچھے محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے اور اس وقت تک نتائج اخذ نہ کرے جب تک کہ اسے مکمل مواد کی فراہمی میں کامیابی حاصل نہ ہو جائے۔

تحقیق میں جذبات، عقیدت یا اپنی پسند ناپسند کا دخل نہیں ہونا چاہیے بلکہ حقیقت پسندی اور غیر جانب داری کا رویہ اختیار کیا جائے۔ بغض و عناد کو کام میں لانا اور جذبات کی رو میں بہنا خطرناک ہوتا ہے اور اس رجحان کی وجہ سے حقائق کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

محقق کو دلائل اور شواہد کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھانا چاہیے۔ لیکن بعض اوقات لاکھ حزم و احتیاط کے باوجود نئے محقق سے غلطیوں کا سرزد ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں لغزشیں اور فروگذاشتیں تو جغادری محققین سے بھی ہو سکتی ہیں۔ ادب کو پرکھنے، جانچنے اور حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے طریقہ ہائے کار کا دائرہ بہت وسیع ہے، تحقیق کے نئے ذرائع اور نئی راہیں بھی دریافت ہو سکتی ہیں اور نئے زاویہ ہائے نظر بھی سامنے آسکتے ہیں۔

تحقیق میں نئی بات کے دریافت کرنے کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر آپ کو کسی ایسی بات کا علم ہوا ہے جو اب تک دوسرے محققوں کی نظر سے اوجھل تھی تو اس تحقیق سے آپ کو بڑی خوشی ہوگی اور اہل نظر یقیناً آپ کے انکشاف کی داد دیں گے۔ نئی معلومات کا انکشاف ایک کم عمر محقق پر بھی ہو سکتا ہے لیکن میدان تحقیق کے نووارد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے منصب اور فرائض کو پیش نظر رکھتے ہوئے محتاط طریقے سے، فخر و مباہات سے دامن بچاتے ہوئے اپنی تحقیق کو اہل نظر کے سامنے پیش کرے، کیوں کہ تحقیق کے دروازے ہمیشہ کھلے ہوتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں آپ کی تحقیق غلط ثابت ہو جائے۔

تحقیق میں جوشِ عمل دکھانا، قیاس آرائی سے کام لینا یا سنی سنائی باتوں پر بغیر دلیل کے عمل کرنا گویا آسمان تک ٹیڑھی دیوار اٹھانا ہے۔ اس خصوص میں نام ور ادیبوں کو تو اور بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیوں کہ مستقبل کے محقق ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر انھیں اپنا رہنما یا آئیڈیل سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کی ذرا سی لغزش سے بے اصل باتیں عام ہو جاتی ہیں۔

جہاں تک دکنی ادب کی تحقیق کا تعلق ہے، یہ ایک ایسا دشت ہے جس کی سیاحی میں راستے کی صعوبتیں اور کٹھن مرحلے اور بھی زیادہ درپیش ہوتے ہیں۔ قدیم مخطوطات کے سمندر کی غواصی کر کے درِ نایاب منظرِ عام پر لانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے کئی ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ تب جا کے کہیں وہ لمحہ نصیب ہوتا ہے جسے "نتیجہ" یا "ثمرہ" کہہ سکتے ہیں۔

بہ قول پروفیسر گیان چند تحقیق کا منصب صداقت کی تلاش ہے اور محقق کا کام تحقیقی کارناموں میں تسامحات کی نشان دہی کرنا بھی ہے اس لیے یہاں دکنی کے چند محققین کی اغلاط اور لغزشوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ محمد باقر آگاہ ویلوری اٹھارویں صدی کے ایک کثیر الجہات شاعر، ادیب، نقاد اور دکنی شعر و ادب کی روایت کے آخری علم بردار تھے۔ انھوں نے دکنی زبان میں مختلف اور متنوع موضوعات پر ڈیڑھ درجن سے زائد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ آگاہ پر دادِ تحقیق دینے والوں میں مولوی نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر زور، پروفیسر یوسف کوکن، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو آگاہ کی اردو تصانیف کے صحیح نام اور ان کی تعداد کا علم ہو سکا ہے اور نہ ان کے واقعاتِ حیات کا واضح خاکہ ہی سامنے آسکا ہے۔ مثال کے طور پر مولوی نصیر الدین ہاشمی نے آگاہ کی سترہ کتابوں کے نام گنوائے ہیں (۶)۔ جن میں سولھویں اور سترھویں نمبر پر بالترتیب "فرائد در عقائد" اور "فرائد در فوائد" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اول الذکر نام (فرائد در عقائد) کی کوئی کتاب آگاہ نے نہیں لکھی البتہ "رسالۂ عقائد" کے عنوان سے ایک کتاب ضرور لکھی ہے۔ جس کا تذکرہ ہاشمی صاحب نے نویں نمبر پر کیا ہے۔ اس کے علاوہ آگاہ کی ایک اور کتاب "فرائد در بیان

فوائد " ہے جو ہاشمی صاحب کی دی ہوی فہرست میں " فرائد در عقائد " کے نام سے سترھویں نمبر پر ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے آگاہ کی ایک اور کتاب " رسالہ فقہ " کا تذکرہ نہیں کیا، جس کا ذکر انھوں نے کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست میں صفحہ ۸۱ پر کیا ہے۔

پروفیسر سروری نے آگاہ کی اردو تصانیف کی تعداد چودا (۱۴) بتائی ہے (۷)۔ جس میں آٹھویں نمبر پر " مثنوی گلزارِ عشق " کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نویں اور دسویں نمبر پر جن کتابوں کا نام " قصہ رضوان شاہ " اور " روحِ افزا " دیے گئے ہیں وہ کوئی علاحدہ کتابیں نہیں بلکہ " گلزار عشق " کے دو مرکزی کردار ہیں۔ اس مثنوی میں آگاہ نے قصہ رضوان شاہ و روح افزا کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یہ دراصل آگاہ کی ایک ہی مثنوی ہے جس کے سروری صاحب نے تین نام بتائے ہیں۔

ڈاکٹر زور نے آگاہ کی اردو تصانیف کی تعداد سترہ بتائی ہے (۸)۔ جس میں چودھویں نمبر پر " فرائد در عقائد " کا نام ملتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا گیا کہ آگاہ نے اس نام کی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ یہ ضرور ہے کہ " رسالہ عقائد " کے زیر عنوان انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا ذکر ڈاکٹر زور نے پہلے نمبر پر " عقائد نامہ " کے نام سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ زور صاحب نے سولھویں نمبر پر " خمسہ متحیرہ " کا نام تحریر کیا ہے۔ حالاں کہ اس کتاب کا نام " خمسہ متحیرۂ اوج آگاہی " ہے اور یہ پانچ مثنویوں (صبح نوبہار عشق۔ ندرتِ عشق۔ غرقابِ عشق۔ حیرتِ عشق اور حسرتِ عشق) کا مجموعہ ہے۔

پروفیسر یوسف کوکن نے آگاہ کی بارہ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے (۹)۔ جن میں درج ذیل کتابوں کے نام شامل نہیں ہیں:

رسالہ فقہ۔ حاشیہ من درپن۔ مناجات آگاہ۔ معراج نامہ۔ ہدایت نامہ۔ ریاض السیر۔ فرقہ ہائے اسلام۔ وفات نامہ رسول اللہؐ۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ نے اپنی کتاب " اردو نثر کا آغاز و ارتقاء " میں آگاہ کی دو تصانیف " محبوب القلوب " اور فرائد دربیان فوائد " کے نام سہواً " معیوب القلوب " اور فوائد در قواعد " تحریر کیے ہیں (۱۰)۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے آگاہ کی اردو تصانیف کی تعداد کا تعین تو نہیں کیا لیکن ان کی سولہ کتابوں کے نام گنوائے ہیں۔ جن میں "خمسہ۔ متحیرہ اوجِ آگاہی" شامل نہیں ہے۔ البتہ پانچ مثنویوں کے اس مجموعے کی دو مثنویوں "صبح نو بہارِ عشق" اور "ندرت عشق" کو دو علاحدہ تصانیف کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے۔ اس کے علاوہ جالبی صاحب نے مثنوی "روپ سنگار" کو "ادب سنگار" لکھا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سے اس سلسلے میں ایک سہو یہ بھی ہوا کہ انھوں نے آگاہ کی اردو تصانیف کا تذکرہ کرتے ہوئے، ان کی فارسی کتاب "احسن التبئین" کا نام بھی شامل کر دیا ہے (۱۱)۔

پروفیسر سیدہ جعفر نے باقر آگاہ کے واقعاتِ حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کا سنہ پیدائش ۱۱۵۸ھ م ۱۷۴۵ء اور شعر گوئی کے آغاز کا سال ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱ء قرار دیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آگاہ نے سات سال کی عمر سے شعر گوئی کی ابتدا کی جو بعید از قیاس ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے آگے چل کر یہ قیاس آرائی بھی کی ہے کہ "آگاہ نے ۳۵ سال کی عمر میں اپنا دیوان مرتب کر لیا ہوگا کیوں کہ شاعری خاص طور پر غزل عہدِ شباب کی پیداوار ہوتی ہے" (۱۲)۔

پروفیسر صاحبہ نے اگر "دیوانِ آگاہ" کے دیباچے کا مطالعہ کیا ہوتا تو پتہ چلتا کہ یہ آگاہ کے عہدِ شباب کی نہیں بلکہ ان کی عمر کے آخری حصے کی پیداوار ہے۔ ایک تو اس لیے کہ دیوان کے مقدمے میں آگاہ نے اپنی کم و بیش تمام اردو تصانیف کا تذکرہ کیا ہے جو اس سے پہلے مرتب ہو چکی تھیں۔ دوسرے یہ کہ خود مصنف کا بیان ہے کہ اس نے گزشتہ تیس بتیس سال کے درمیان نظم کیا ہوا اردو اور فارسی کلام اپنے مرشد (حضرت قربی ویلوری) کے انتقال کے بعد ضائع کر دیا (۱۳)۔

ترتیب و تدوینِ متن، تحقیق کا ایک ایسا شعبہ ہے، جس میں سب سے زیادہ الجھنوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ رشید حسن خاں، تدوین متن کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "تدوین کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ متن کو مصنف کے مقصود کے مطابق پیش کیا جائے لیکن اس میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اکثر صورتوں میں پرانی تحریروں کے سلسلے میں یہ کہنا بہت مشکل

ہوتا ہے کہ اولین صورت یا اصل صورت کیا تھی، اس لیے یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ متن کو منشاء مصنف کے مطابق یا اس سے قریب ترین صورت میں پیش کیا جائے (۱۴)۔

تدوین متن کے سلسلے میں مختلف خطوں جیسے نسخ، ثلث اور شکستہ وغیرہ سے واقفیت کے علاوہ کاتب یا مصنف کے طرز تحریر یا نہج خط سے آشنا ہونا بھی ضروری ہے کیوں کہ بعض کاتب مختلف حروف اور الفاظ کو اپنے مخصوص انداز میں تحریر کرنے کے عادی ہوتے ہیں، جو بہ آسانی پڑھے نہیں جا سکتے۔ قدیم مخطوطات کی تدوین کے سلسلے میں میں محقق متن کو "زبان میں، عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں اور املا و تلفظ کے تغیر و تبدل پر نظر رکھتے ہوئے غیر مانوس، مشکل اور متروک الفاظ کے معنی و مفہوم کی وضاحت بھی کرنی چاہیے۔ اگرچہ یہ ایک دشوار اور صبر آزما کام ہے۔

"دیوان ولی" کو گارساں دتاسی نے سب سے پہلے ۱۸۳۳ء میں پیرس کے چھاپے خانے سے شائع کیا تھا بعد کو مطبع حیدری بمبئی (۱۲۹۰ھ) نول کشور پریس لکھنو (۱۸۷۸ء) سے اس کے متعدد ایڈیشن منظر عام پر آئے۔ حیدر ابراہیم سایانی نے ۱۹۲۱ء میں "دیوان ولی" کا نیا ایڈیشن شائع کیا تھا لیکن احسن مارہروی (۱۹۲۷ء) اور نور الحسن ہاشمی (۱۹۴۵ء) کے مرتبہ "دیوان ولی" سے قبل جتنے بھی ایڈیشن چھپے ہیں ان تمام میں تدوین و تحقیق متن کی بے شمار غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ابراہیم سایانی کے مرتبہ "دیوان ولی" میں جگہ جگہ قدیم الفاظ کو جدید لفظوں سے تبدیل کیا گیا ہے۔ چناں چہ اس دیوان کا پہلا شعر یوں ہے

رکھتا ہوں تیرے نام کو میں ورد زبان کا ‏ ‏ ‏ ‏ کرتا ہوں تیرے شکر کو عنوان بیاں کا

جب کہ "دیوان ولی" کے اکثر قلمی نسخوں میں "رکھتا" کی جگہ "کیتا"، نام کی جگہ "نانوں" اور کو کی جگہ "کوں" کے الفاظ ملتے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی مرتبہ کتاب "اردو شہ پارے" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ "بڑا نقص اس کتاب کا یہ ہے کہ انتخابات کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ نامانوس اور مشکل الفاظ کا حل نہیں کیا گیا۔ پڑھنے والے کے لیے ایسی کتابیں کسی کام کی نہیں ہوتیں" (۱۵)۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مرتبہ "دیوان نصرتی" میں بعض مقامات پر تدوین متن کی فرو گذاشتیں نظر آتی ہیں۔ "قصیدہ چرخیہ" کا ایک شعر دیکھیے:

سیر سوں جب سیر ہو شعر گوئی میں گیا — سبز بیابان تب پھیر کوں نکلے ہرن

(۱۶)

قصیدے کے مضمون اور سیاق و سباق کو پیش نظر رکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ شعر میں "شیر کے گوی میں جانے" کا تذکرہ کیا گیا ہے نہ کہ "شعر گوئی" کا۔ تھوڑی سی ترمیم کے بعد اس شعر کی تشکیل یوں ہو گی:

سیر سوں جب سیر ہو شیر گوی میں گیا — سبز بیابان تب پھیر کوں نکلے ہرن

چھان بین اور تلاش و جستجو کے ذریعے حقائق تک پہنچنے کی ذمے داری محققین کے پہلو بہ پہلو ادبی مؤرخین پر بھی عائد ہوتی ہے۔ خصوصاً ماخذ اور شخصیتوں کو حزم و احتیاط سے کام لینا بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنے ایک مضمون "اردو کی ادبی تحقیق آزادی سے پہلے" میں سید محمد کی مرتبہ کتابوں میں محمد علی عاجز (کذا) کی مثنوی "قصہ، ملکہ، مصر" کا نام بھی شامل کر دیا ہے (۱۷)۔ لیکن سید محمد صاحب کی مرتبہ اس نام کی کوئی کتاب ہنوز شائع نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر اعجاز حسین نے بہت پہلے "مختصر تاریخ ادب" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی، جس میں دکنی شعرا اور ادیبوں کے تعلق سے بے شمار فرو گذاشتیں راہ پا گئی تھیں۔ اس کتاب کے متعدد ترمیم شدہ ایڈیشن بھی چھپے اور حال ہی میں ڈاکٹر سید محمد عقیل کے ترمیم و اضافے کے ساتھ ایک تخمیم ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ لیکن اس میں بھی قدیم ادب سے متعلق اغلاط کی تصحیح نہیں کی گئی۔ اس کتاب کی صرف ایک مثال دیکھیے "نصرتی" کے بارے میں پہلا جملہ اس طرح مندرج ہے:

> "محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص۔ اورنگ زیب نے جب بیجاپور کو فتح کیا (۱۶۸۵ء / ۱۰۹۷ھ) تو یہ موجود تھے" (۱۸)۔

جب کہ نصرتی کے کلام کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اسے زوال بیجاپور سے ۱۲ سال قبل شہید کر دیا گیا تھا "نصرتی شہید است" (۱۹) سے اس کی تاریخ وفات (۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء) برآمد ہوتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے "اردو ادب کی مختصر تاریخ" میں ابن نشاطی کا سال وفات ۱۵۷۳ء (۹۸۱ھ) یعنی "پھول بن" کی تاریخ تصنیف (۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۵ء) سے ۸۲ سال پہلے بتایا ہے (۲۰)۔

ترتیب و تصحیح متن کا ایک مشکل اور صبر آزما کام الحاق و اضافہ کی نشاندہی ہے۔ الحاق کہیں جان بوجھ کر ہوتا ہے۔ کہیں اظہار عقیدت سے مجبور ہو کر، کہیں مالی منفعت کی خاطر اور کہیں کاتب کی بے توجہی کے سبب۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے تو قطعی ثبوت کی عدم موجودگی میں یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

غواصی کی مثنوی "مینا ستونتی" میں حمد کی ضخامت [illegible] نعت محمد مصطفیٰ و چہار یار و منقبت علی مرتضیٰ کے عنوان کے تحت چہار یار کا اضافہ اور اس عنوان کے دیے ہوئے اشعار دکنی ادب میں الحاقی کلام کے نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں "مینا ستونتی" میں الحاقی کلام کو نسخے میں شامل [illegible] غلام عمر خاں نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ جب [illegible] میں چہار یار [illegible] عنوان مطبوعہ اشعار، مرتب متن کی فروگذاشت کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح عبداللہ قطب شاہ کے مطبوعہ دیوان میں غواصی کی ۳۱ غزلوں کا تخلص کی تبدیلی کے ساتھ شامل ہونا محض کاتب کی بے احتیاطی کی نتیجہ نہیں ہے۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ ان غزلوں کو خود ملک الشعرا غواصی نے مالی منفعت کے پیش نظر بادشاہ وقت کی خدمت میں پیش کیا ہو۔

تحقیق اور اس کے طریقہ کار [illegible] عنوان سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں ۳۱ دسمبر ۱۹۹۴ء کو منعقد ہونے والے کل ہند ورکشاپ میں پڑھا گیا۔

مطبوعہ ہماری زبان دہلی۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۶ء ص

حوالے:

(۱) مبادیات تحقیق۔ ادبی پبلشرز بمبئی۔ ۱۹۶۹ء ص ۳

(۲) تحقیق و تنقید۔ مشمولہ "اردو میں اصول تحقیق" [illegible] ۱۹۸ [illegible]

(۳) اصول تحقیق "ادبی اور لسانی تحقیق" مرتبہ عبد الستار ردلوی ۔ بمبئی ۱۹۸۴. ص ۷۷
(۴) تدوین و تحقیق کے رجحانات ۔ مشمولہ "اردو میں اصول تحقیق" (جلد اول) ص ۲۸۳
(۵) تحقیق کا فن ۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی ۔ لکھنؤ ۱۹۹۰. ص ۵
(۶) کتب خانہ ۔ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ۔ ص ۳۳
(۷) اردو مخطوطات ۔ کتب خانہ ۔ جامعہ عثمانیہ ص ۱۸
(۸) تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول) ص ۷۷
(۹) باقر آگاہ ۔ ص ۹۷ تا ۱۲۸
(۱۰) ص ۲۴۲
(۱۱) تاریخ ادب اردو (جلد دوم) حصہ دوم ص ۱۰۱۱
(۱۲) دکنی رباعیاں ص ۲۱۰
(۱۳) باقر آگاہ کے الفاظ یہ ہیں "یہ حقیر نارس آگے تیس بتیس برس کے کیا فارسی اور کیا ہندی (اردو) سب اقسام میں نظم کیا تھا اور ان سب کو بعد انتقال مرشد قدس سرہ دھو ڈالا" (دیباچہ دیوان آگاہ قلمی)
(۱۴) منشائے مصنف کا تعین ۔ مشمولہ ۔ تدوین متن کے مسائل" ۔ خدا بخش لائبریری ۔ پٹنہ ۔ ص ۳۴
(۱۵) تنقیدات عبد الحق (۱۹۵۶.) ص ۴۳
(۱۶) دیوان نصرتی ۔ مطبع قوسین لاہور ۔ ص ۳۷
(۱۷) مضمون مشمولہ "ذکر و فکر" طبع اول ص ۲۳۲
(۱۸) "مختصر تاریخ ادب اردو" مرتبہ اعجاز حسین ۔ ترمیم و اضافہ ڈاکٹر عقیل رضوی ۔ الہ آبادی ۱۹۸۳. ص ۲۰
(۱۹) مکمل قطعہ تاریخ یوں ہے:

ضرب شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ — جا کے جنت کے گھر میں خوش ہو رہا
سال تاریخ آ ملائک نے — یوں کہی "نصرتی شہید ہوا"

(۲۰) اردو ادب کی مختصر تاریخ ۔ اسلام آباد ۔ (۱۹۹۱.) ص ۱۱۶۔

○ ○ ○

دیوان ولی کا ایک نادر مخطوطہ

ولی اردو شاعری کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ایک طرف دکنی شاعری کی عظیم شاہ راہ اختتام کو پہنچتی ہے تو وہیں دوسری طرف شمالی ہند میں اردو شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ولی نے ریختہ کے روپ میں جنوب اور شمال کی شعری روایات کو ایک ادبی وحدت میں منسلک کر کے ایک ایسا تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا کہ تمام ہندستان کے چھوٹے بڑے شاعروں نے اسے اپنا ادبی رہنما اور استاد سخن تسلیم کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ عہد قدیم ہی میں "دیوان ولی" کی وسیع پیمانے پر پذیرائی ہوئی تھی۔ چناں چہ دیوان ولی کے متعدد نسخے نہ صرف ہندو پاک کے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی کتب خانوں کی زینت ہیں بلکہ یورپ اور امریکہ کی لائبریریوں میں بھی محفوظ ہیں۔ اکرام چغتائی نے اپنے ایک مضمون میں "دیوان ولی" کے ۱۱۸ نسخوں کا تذکرہ کیا ہے (۱) ان مخطوطات کے علاوہ مشفق خواجہ نے "جائزۂ مخطوطات اردو" میں ولی کے دیوان کے مزید ۱۹ نسخوں کی نشان دہی کی ہے (۲)۔ محمد حسین آزاد نے "دیوان ولی" کی دلی میں آمد اور مقبولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "جب دیوان ولی دلی پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا۔ قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت نے زبان سے پڑھا، گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں اس کی غزلیں گانے لگے ۔۔۔۔۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا" (۳)

پیش نظر مضمون میں دیوان ولی کے ادارۂ ادبیات اردو۔ حیدرآباد کے مخزونہ ایک قدیم ترین مخطوطے (نمبر ۵۲۲) کو موضوع بحث بنا رہے ہیں۔ یہ نسخہ خط نستعلیق میں ہے اور ۱۱۵۲ھ کا مکتوبہ ہے۔ مسطر ۱۳ سطری ہے اور تقطیع ۱/۲ ۷ × ۱/۲ ۵ ہے۔ اس مخطوطے کا پہلا ورق ضائع ہو گیا ہے۔ اور موجودہ شکل میں اس کی پہلی غزل کا ابتدائی شعر یہ ہے:

نہیں یو آہ ہور زاری جو سینے اور انکھیاں میں ہے
سمجھ بے شک کہ افسوں ہے سو اس پیو کے لبھانے کا

مخطوطے کا آغاز غزلوں سے ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد مخمسات، رباعیات، ترجیع بند، مستزاد، قصائد، مثنویاں اور فردیات نقل کیے گئے ہیں۔ تخلص اور عنوانات سرخ روشنائی میں ہیں۔اس نسخے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کتابت ولی کے ایک ہم وطن اور باکمال شاعر بتدی اورنگ آبادی نے کی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق ولی کی وفات ۱۱۳۳ھ (۴) اور ۱۱۴۴ھ (۵) کے درمیانی عرصے میں ہوئی۔ اگر ہم ولی کے انتقال کا سال ۱۱۴۲ھ قیاس کریں تو زیر نظر دیوان، ولی کی وفات کے دس سال بعد لکھا گیا ہے۔اس دیوان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بتدی (کاتب) نے اس کے حاشیوں پر جگہ جگہ ولی کی متعدد غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان کی کتابت کے بعد کاتب کو جوں جوں نئی غزلیں ملتی رہیں اس نے حاشیے پر ان کا اضافہ کر دیا۔اگر دیوان ولی کے مختلف قلمی نسخوں سے ان کا تقابل کیا جائے تو ان منظومات کی تاریخ تصنیف کے تعین کی راہیں کھل سکتی ہیں۔اختلاف نسخ کے اعتبار سے بھی اس نسخے کی بڑی اہمیت ہے۔ایک تو اس لیے کہ اس کا کاتب ولی کا مداح، ہم وطن اور ایک اچھا شاعر ہے اور دوسرے یہ کہ اس نسخے کی کتابت عہدِ ولی کے قریبی زمانے میں ہوئی۔یوں تو دیوان ولی کی اشاعت ۱۸۳۳ء۔ ۱۹۵۴ء کے درمیان چھ بار عمل میں آئی، لیکن احسن مارہروی اور نورالحسن ہاشمی نے اس کی ترتیب وتدوین میں بڑی چھان بین اور عرق ریزی سے کام لیا ہے (۶)۔ زیر بحث مخطوطے سے احسن مارہروی نے دیوان ولی کی تدوین میں استفادہ نہیں کیا، لیکن نورالحسن ہاشمی نے اسے پیش نظر رکھا تھا۔

یہاں احسن مارہروی اور نورالحسن ہاشمی کے مرتبہ دواوین ولی سے پیش نظر نسخے کا تقابلی مطالعہ کر کے اختلاف نسخ کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ "دیوان ولی" کے دونوں مرتبین نے صحت متن اور قدامت کے باوجود پیش نظر مخطوطے سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا۔

۱۔پیش نظر نسخہ: توں آج جو سینہ شاد دستا

مطلب ہے کہ بامراد دستا
(۷)

احسن مارہروی: توں اب ہے سینہ شاد دستا
مطلب ہے کہ بامراد دستا (۸)

نورالحسن ہاشمی: توں آج ہے سینہ شاد دستا
مطلب ہے کہ بامراد دستا (۹)

۲۔پیش نظر نسخہ: جولاں گری میں گرم ہے وہ شہسوار آج
سینے سوں عاشقاں کے اٹھیا ہے غبار آج (۱۰)

احسن مارہروی: جولاں گری میں گرم ہے وہ شہسوار آج
سینے سوں عاشقاں کے اٹھے ہے غبار آج (۱۱)

نورالحسن ہاشمی: جولاں گری میں گرم ہے وہ شہسوار آج
سینے سوں عاشقاں کے اٹھے ہے غبار آج (۱۲)

۳۔پیش نظر نسخہ: دل کی مچھلی پر سٹیا تجہ برہ نے جنجال جال
دام میں تجھ زلف کے ہیں مرغ دل بے حال حال (۱۳)

احسن مارہروی: دل کی مچھلی پر سٹا تجہ برہ نے جنجال جال
دام میں تجھ نیہ کے دل کا ہوا بے حال حال (۱۴)

نورالحسن ہاشمی: دل کی مچھلی پر سٹا تجہ برہ نے جنجال جال
دام میں تجھ نیہ کے دل کا ہوا بے حال حال (۱۵)

۴۔پیش نظر نسخہ: تسبیح کوں بندگی کی ڈالیا اپس کے گل میں
دیکھیا جو تجھ صنم کے زنار کا تماشا (۱۶)

احسن مارہروی: رشتے کوں بندگی کے ڈالیا اپس گلے میں
دیکھا جو تجھ صنم کے زنار کا تماشا (۱۷)

نورالحسن ہاشمی: ہندو نے صاف دل سیں ڈالا اپس گلے میں
دیکھا جو تجھ صنم کے زنار کا تماشا (۱۸)

۵۔پیش نظر نسخہ: بے قصد مجہ زباں پر آتا ہے لفظ رنگیں

دیکھیا ہوں جب سوں تیری رفتار کا تماشا

(۱۹)

احسن مارہروی: بے قصد مجھ زباں پر آتا ہے لفظ تمکیں
دیکھا ہوں جب سوں تیری رفتار کا تماشا (۲۰)

نورالحسن ہاشمی: بے قصد مجھ زباں پر آتا ہے لفظ تمکین
دیکھا ہوں جب سوں تیری رفتار کا تماشا (۲۱)

۶۔پیش نظر نسخہ: کتاب العشق مکہ یو ہے صفا تیرا صفا دستا
ترے ابرو کے دو مصرعے یو اس کا ابتدا دستا **(۲۲)**

احسن مارہروی: کتاب حسن کا یہ مکھ صفا تیرا صفا دستا
ترے ابرو کے دو مصرعے یہ اس کا ابتدا دستا (۲۳)

نورالحسن ہاشمی: کتاب الحسن کا یہ مکھ صفا تیرا دستا
ترے ابرو کے دو مصرعے یہ اس کا ابتدا دستا (۲۴)

دونوں مرتبین نے آخرالذکر غزل کے درج ذیل شعر کو شامل متن نہیں کیا:

ترے غم میں سوائے موہن ہوا جیوں کاہ میرا تن
نین تیرے کا یو انجن سو مجہ کوں کہربا دستا (۲۵)

زیر بحث نسخے میں ولی کے دیوان کی کتابت کے بعد بہتدی نے اپنا کلام قلم بند کیا ہے جس میں ولی کی ۱۹ غزلوں کی تضمین بھی شامل ہے۔ ولی کی غزل پر لکھے ہوئے ایک مخمس کے دو بند دیکھئے جن سے بہتدی کی شعری صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے:

برہ کی رات جوں اماس ہے درد و غم اس کے بارہ ماس ہے
دودھیائی بڑی نراسی ہے کوچۂ یار عین کاسی ہے
جوگیٔ دل وہاں کا باسی ہے

جس نے کچھ مال ابرہن پہ رکھیا اس نے خوبی اپس کے من پہ رکھیا
بہتدی نے صندل بدن پہ رکھیا اے ولی جو لباس تن پہ رکھیا
عاشقاں کے نزک لباسی ہے (۲۶)

زیر نظر مخطوطے کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ کاتب (بتدی) نے، مختلف منظومات کی سرخیوں کے طور پر ولی کا نام بھی تحریر کر دیا ہے۔ جیسے "ترجیع بند ولی محمد"، مخمسات ولی محمد"، "مثنوی ولی محمد" وغیرہ۔ ان عنوانات سے اس بات کی مزید شہادت ملتی ہے کہ ولی کا نام ولی اللہ، محمد ولی، شاہ ولی اللہ یا شمس ولی اللہ نہیں بلکہ ولی محمد تھا۔ صاحب گلشن گفتار نے بھی یہی نام لکھا ہے اور ولی کے عزیز ترین دوست سید ابو المعالی کے فرزند ثناء اللہ کے مکتوبہ "دیوان ولی" کے مخطوطے میں بھی یہی نام ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر زور:

> "اس کلیات کی وجہ سے اس امر کا مزید ثبوت فراہم ہو جاتا ہے کہ ولی کا نام سید ولی اللہ حسینی نہیں تھا اور مولوی عبدالحق نے ولی کی تاریخ وفات کے بارے میں جس قطعہ سے معلومات فراہم کی ہیں وہ ولی اورنگ آبادی سے متعلق نہیں ہے بلکہ کسی اور بزرگ سید ولی اللہ حسینی سے متعلق ہے۔ ممکن ہے کتاب "ولی گجراتی" میں جن ولی اللہ حسینی کا ذکر ہے ان سے تعلق رکھتا ہوں اور وہ ولی اللہ ایک صوفی اور ولی ضرور تھے مگر شاعر نہیں تھے۔" (۲۷)

حوالے و حواشی:

(۱) دیوان ولی کے قلمی نسخے۔ مشمولہ سہ ماہی اردو۔ کراچی۔ جولائی تا اکتوبر ۱۹۶۶ء۔

(۲) جائزۂ مخطوطات اردو۔ لاہور۔ ص ۱۸۷

(۳) آب حیات۔ ص ۸۴

(۴) فراقی کی مثنوی "مراۃ الحشر" ۱۱۳۲ھ کی تصنیف ہے جس میں مرحوم شعرا کا تذکرہ ہے اور اس میں ولی کا نام نہیں ملتا۔

(۵) وجدی نے اپنی مثنوی "مخزن عشق" ۱۱۴۴ھ میں لکھی جس میں ولی کا مرحوم شاعر کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔

(۶) احسن مارہروی کا مرتبہ دیوان ۱۹۲۷ء میں انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد سے شائع ہوا تھا۔ جب کہ نور الحسن ہاشمی کا مرتبہ دیوان ۱۹۵۴ء میں دہلی سے شائع ہوا۔

(۷) مخطوطہ نمبر ۵۲۲۔ ورق ۲۲

(۸) دیوان ولی - مرتبہ احسن مارہروی - ص ۲۹
(۹) دیوان ولی - مرتبہ نورالحسن ہاشمی ص ۳
(۱۰) مخطوطہ نمبر ۵۲۲ - ورق ۲۷
(۱۱) دیوان ولی - مرتبہ احسن مارہروی ص ۷۷
(۱۲) دیوان ولی مرتبہ نورالحسن ہاشمی ص ۳۷
(۱۳) مخطوطہ نمبر ۵۲۲ - ورق ۴۱
(۱۴) دیوان ولی - مرتبہ احسن مارہروی ص ۱۳۱
(۱۵) دیوان ولی - مرتبہ نورالحسن ہاشمی ص ۱۱۷
(۱۶) مخطوطہ نمبر ۵۲۲ - ورق ۲۱
(۱۷) دیوان ولی - مرتبہ احسن مارہروی ص ۱۱۷
(۱۸) دیوان ولی - مرتبہ نورالحسن ہاشمی ص ۱۱
(۱۹) مخطوطہ نمبر ۵۲۲ - ورق ۲۱
(۲۰) دیوان ولی - مرتبہ احسن مارہروی ص ۳۷
(۲۱) دیوان ولی - مرتبہ نورالحسن ہاشمی ص ۱۱
(۲۲) مخطوطہ نمبر ۵۲۲ - ورق ۷
(۲۳) دیوان ولی - مرتبہ احسن مارہروی ص ۳
(۲۴) دیوان ولی - مرتبہ نورالحسن ہاشمی ص ۲۸
(۲۵) مخطوطہ نمبر ۵۲۲ - ورق ۷
(۲۶) ایضاً ورق ۶۱

مطبوعہ "سب رس" حیدرآباد - جون ۱۹۹۶ء -



دکنی کے چند نایاب مراثی

لفظ مرثیہ عربی زبان کے لفظ "رثا" سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ میت پر آہ وزاری کرنے کے ہیں۔ اصطلاح شاعری میں مرثیہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر کسی شخص کے دنیا سے اٹھ جانے پر اپنے جذبات غم کا اظہار کرتا ہے اور مرنے والے کے اوصاف بیان کر کے اسے خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ مرثیے کے لیے کسی مخصوص ہیئت یا ترتیب قوافی کی کوئی شرط نہیں، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مربع، مخمس، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند غرض جس ہیئت میں چاہے مرثیہ لکھا جاسکتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے مرثیے کی صنف واقعات کربلا سے مختص ہو گئی ہے لیکن اردو میں ایسے مرثیوں کی بھی کمی نہیں، جن میں واقعات کربلا سے ہٹ کر مختلف شخصیتوں کی وفات پر اظہار غم کیا گیا ہے۔

اردو ادب کے دکنی دور میں دیگر اصناف شاعری کی طرح مرثیہ نگاری پر بھی باقاعدہ توجہ کی گئی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے بانی عقائد کے اعتبار سے شیعہ تھے۔ بیجاپور اور گولکنڈے میں شاہی عاشور خانے موجود تھے جہاں سرکاری انتظامات کے تحت مجالس عزا کا انعقاد عمل میں آتا تھا۔ گویا دکن کی فضائیں مرثیے کے لیے خصوصی طور پر سازگار تھیں (۱) ۔ چناں چہ دکنی کے کم و بیش تمام بلند پایہ شعراء، جیسے محمد قلی قطب شاہ، اسد اللہ وجہی، ملک الشعرا غواصی، عبداللہ قطب شاہ، ملک خوشنود، نصرتی، ہاشمی وغیرہ کے کلام میں دیگر اصناف شاعری کے پہلو بہ پہلو مرثیے بھی مل جاتے ہیں لیکن اس خصوص میں دبستان دکن کے مرزا اور قادر کو اس لیے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کہ ان شعراء نے صرف مرثیہ نگاری ہی کے میدان میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

پیش نظر مضمون میں ہم دکنی اردو کے چند معروف اور غیر معروف شعرا کے

نادر و نایاب مرثیے تدوین متن کے ساتھ پیش کر رہے ہیں ۔ یہ تمام مرثیے کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد کی قلمی بیاضوں (۲) سے ماخوذ ہیں ۔

۱۔ قطبی:

قطبی ، عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵ء ۔ ۱۶۷۲ء) کے دور کا شاعر ہے ۔ جس نے " مینا نامہ " اور " چڑیا نامہ " کے نام سے دو صوفیانہ نظمیں لکھی ہیں ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی اطلاع کے مطابق قدیم بیاضوں میں قطبی کی غزلیں اور مرثیے بھی ملتے ہیں (۳) " مینا نامہ کے درج ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غوث اعظم کے سلسلے میں بیعت تھا:

ارے قطبی نہ کر توں فکر بھاری　　کہ ہے توں غوث الاعظم کا بھکاری

افسر صدیقی امروہوی نے " بیاض مراثی " میں ۹/ اشعار پر مشتمل قطبی کا ایک مرثیہ شائع کیا ہے جس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے:

سب ذوق کے جلے ہیں شجر ہائے ہائے　　طوبی کے سب سوکھے ہیں ثمر ہائے ہائے

قطبی نے صاف دل سوں حسینا کے غم منے　　کرتا ہے درد شام و سحر ہائے ہائے

اس مضمون میں ہم قطبی کا ۹/ اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ پیش کر رہے ہیں:

محرم چاند ماتم کا کماں ہو جگ پو[5] دھایا[6] ہے
سورج ترکش، کرن ناوک دکھیا[7] ہو مک[8] چھپایا ہے

حسین کے درد کا نشتر چو بیا[9] مجہ[10] دل کی شارگ[11] میں
فوارا اس زخم سوں[12] پڑ کلیجا لھو[13] میں نہایا[14] ہے

فلک منذف[15]، چندر مشعل[16]، ستارے سب دیوے[17] روشن
جگا جگ جوت[18] کر جگ میں کہ شہ کا عرس آیا ہے

جو گھٹ[19] کھنجن[20]، غم باراں، جھمکتیاں[21] آہ کیاں بجلیاں[22]
انجو[23] برسانت[24] کر جگ میں جھرے[25] ماتم کے لیایا ہے

سنے کے مج[۲۶] الاوے میں ہوا ہے گھور اس دل کا
انجو کا تیل کر سٹ[۲۷] دے اسے تن من سب جلایا ہے

نبی کے خانداں اوپر کیسے ظالم ظلم جگ میں
یو لایق سب سیاہی کر خدا دوزخ میں بھایا[۲۸] ہے

زمانے کوں حلاوت نیں[۲۹] حسین سرور کے ماتم سوں
چندر کی لھو بھری کفنی گگن[۳۰] تے پھاڑ بھایا[۳۱] ہے

حسین کے غم کے چنگیاں[۳۲] جھڑ محباں کے دروُنے[۳۳] میں
سلگ کر جل اٹھیاں[۳۴] چوندھر[۳۵]، دھواں سب جگ پو چھایا ہے

ختم اس درد میں قطبی ... جیوں عالم روشن
قیامت کوں حسین شہ کا شفاعت سرپو سایا ہے
(بیاض نمبر ۳۔ ورق ۳۳)

۲۔ نصیری:

نصیری کے نام اور وطن کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ افسر صدیقی امروہوی نے اپنی کتاب "بیاض مراثی" میں اس کے دو مرثیے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"نصیری کے دو اردو مرثیے ہیں لیکن ان کے حالات ناقابل حصول ہیں۔ کلام میں اچھی خاصی قدامت ہے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ گیارھویں صدی ہجری کے اواخر کے شاعر ہوں گے" (۳۶)۔

افسر صدیقی صاحب کے پیش کردہ مراثی بالترتیب ۱۴/ اور ۱۲/ اشعار پر محیط ہیں۔ جن کے مطلعے اور مقطعے درج ذیل ہیں:

روتے حسینا تجھ بدل صاحب جمالاں کے دلاں
تپتے ہیں تجھ قد سرو بن نازک نہالاں کے دلاں

پڑتے ہیں دکھ کے مرثیے زاری سوں رو رو کر بلا
غمگیں نصیری کے سدا سارے ثیالاں کے دلاں

- -

روتے محرم دیکھ کر ترلوک سارے ہاے ہاے
لیتے ہیں سینے مار سب غم کے کٹارے ہاے ہاے

نادل نصیری شاد کر، سب عیش کوں برباد کر
--- ---- --- -- --- --- ہاے ہاے

پروفیسر محمود قادری نے اپنے مضمون " دکنی کے چند غیر مطبوعہ مرثیے " مشمولہ " مجلہ۔ تحقیقات اردو " عثمانیہ یونیورسٹی (۱۹۸۰ء) میں نصیری کے ایک مرثیے کو سہواً ملک الشعرا نصرتی سے منسوب کر دیا ہے (۳۷)۔ نو اشعار پر مشتمل اس مرثیے کا مطلع اور مقطع یہ ہے:

شہاں کے کارن نس دن دکھوں ساتوں گگن روتے
دلوں کے سب امن سٹ کر محباں کے چمن روتے

دلوں میں غم کے لگ تن کے، بندے بند کے جدائی کے
نصیری کے کیرے تن تن سدا بھوں نین روتے

(بیاض ۔۳۔ ورق ۱۳)

قادری صاحب نے مذکورہ مرثیہ ادارۂ ادبیات اردو۔ حیدرآباد کی کسی قلمی بیاض سے بغیر حوالے کے نقل کیا ہے۔ یہ مرثیہ کتب خانہ سالار جنگ کے ایک مخطوطے (بیاض مراثی ۳) میں بھی موجود ہے، جس میں شاعر کا تخلص واضح طور پر " نصیری " پڑھا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم نصیری کے تین غیر مطبوعہ اور نایاب مرثیے پیش کر رہے ہیں:

سٹتا[۳۸] ہے مج سنے میں اگن[۳۹] غم امام کا
دیتا ہے داغ دل کوں یو ماتم امام کا

انجواں[۴۰] بھتے ہیں لھو کے نین سوں اسی بدل
بے جاں کیا ہے تن کوں مرے غم امام کا

کئی بھانت سوں دیے ہیں جفا وو پلید مل
لیتے اتھے[۴۱] وہ اسم معظم امام کا

دھرنا[۴۲] اتال[۱/۴۲] دل کی پٹی[۴۳] سوں خوشی تمام
برہم ہوا ہے غم سیتی عالم امام کا

ہے تاج دار حشر میں بے شک کہ جن[۴۴] دھرے
نت[۴۵] سیس[۴۶] پر وو نقش مکرم امام کا

کرتے ہیں نت لباس بنفشی محب تمام
جو دیکھتے ہیں ماہ محرم امام کا

راضی اچھیں[۴۷] گے اس سوں خدا ہور رسول و آل
جس دل پہ اچھے[۴۸] مہر مکرم امام کا

مشہور ہے جہاں منے[۴۹] خوباں سوں یو سخن
چھتا[۵۰] وہی کہ نت کرے ماتم امام کا

یاراں کہیں کہ حشر میں آکر امام کوں
نس[۵۱] دن نصیری. دل پہ دھرے دم امام کا

(۲)

عالم ہوا ہے غم سیتے برباد یا علی
غم کا ہوا ہے جگ منے بنیاد یا علی

کیوں فاطمہ کے باغ کوں کاٹے ہیں کوفیاں
روتا کھڑا ہے پانو پہ شمشاد یا علی

غم کے پہاڑ پھوڑ نہ ست کر دیا وو[52] جیو[53]
پروا شیریں کی چھوڑ کر فرہاد یا علی

سود و زیاں کے گنہ سوں نیں ہے مجھے خبر
کرنا اپس[54] کے لطف سوں ارشاد یا علی

کفناں گلے میں ڈال کے آئے ہیں سب غلام
منگتے ہیں حق سیتے یو تیرا داو یا علی

دوزخ میں کیوں پڑے وو تری دوستی سنگات
آتش سیتی نصیری ہے آزاد یا علی

(۳)

بے زار جگ سو ہو کے چلے شہ سوار آج
سب موموناں کے گھر میں پڑیا[55] ہے پکار آج

سدبد اپس کی چھوڑ کے بیٹھے ہیں دوستاں
نئیں سوجتا ہے نین[56] میں لیل و نہار آج

ہانکاں[57] پہ ہانک جگ منے کیا بے شمار ہے
گویا ہوا ہے جگ منے روز شمار آج

اس دکھ تے کیوں رہویں گے[58] دو عالم قرار سوں
جنت میں بے قرار ہیں دلدل سوار آج

یک لمحہ دل خوشی بھی نہ دیکھوں دنیا منے
یکساں ہوا ہے مجھ کوں یو[59] گھر ہور مزار آج

سینے کی آگ جا کے جلاتی دماغ کوں
سودا ہوا ہے سر میں مرے آشکار آج

نئیں مجھ خبر اپس سیتے ہور ہوش سر سیتے
دھرتا ہوں سیس[60] دار پہ منصور وار آج

ماتم سرا ہوا ہے وو دار السرور سب
جاتی ہے انبیاء کی قطاراں قطار آج

بیہوش ہو پڑے ہیں ملک ہور بشر تمام
نئیں دیکھتا ہوں کس[61] نے صبر و قرار آج

غم ہور الم نے شہہ کے نصیری کے دل اپر
آکر رچّیں[62] ہیں بھار[63] ہزاراں ہزار آج

(بیاض ۔۳۔ورق ۸۰)

۳۔ارجمند:

ارجمند بارھویں صدی ہجری کا ایک گمنام دکنی شاعر ہے، اس کے حالات زندگی پردۂ تاریکی میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصیری اور علی رضا کا ہم عصر تھا۔ غالباً اسی لیے تینوں کے مرثیے ایک ہی بحر اور ایک ہی قافیہ و ردیف میں ہیں۔ نصیری کا آخر الذکر مرثیہ اسی زمین اور قافیہ و ردیف میں تھا۔ علی رضا کے مرثیے کا مطلع اور مقطع ملاحظہ کیجیے۔

ماتم کا شاہ دیں کے چوبیا دل پہ خار آج
ہے تن منے جگر یو مرا بے قرار آج
اس شاہ دو جہاں کی مصیبت سیتے رضا
دیتا ہے داغ دل پہ ہزاراں ہزار آج

ارجمند کا پیش نظر مرثیہ نو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعے سے شاعر کی زبان و بیان کا اندازہ ہوتا ہے:

یاراں حسین شہ پو[۶۴] کرد جاں نثار آج
رو رو کے دل میں دکھ کے بھرو نت انگار آج

اس درد کی اگن سوں محباں کے دل بھتر[۶۵]
جل جل ہوئے ہیں خاک خوشیاں کے انبار آج

ناتوڑ امر حق کا شہادت کوں کر قبول
گردِ فنا کوں چھوڑگے شہہ سوار آج

صد حیف ہزار حیف کہ آلِ رسول پر
کیسا ستم کیے ہیں دیکھو مل کفار آج

کاں[۶۶] گم گئے نبی کے نبوت کے او رتن
ڈھونڈتا ہے جیے آہ ازل کا ستار آج

جس تن کوں فاطمہ نے کیے پرورش اپے[۶۷]
اس ذات کوں لگے ہیں زخم بے شمار آج

کیا انبیاء کیا اولیاء کیا غوث کیا قطب
روتے ہیں غم سوں شہ کے ہوکر بے قرار آج

بوسہ گلے کوں جس کے دیے خاتم النبی
کیوں اس چلے گلے پو ہیں خنجر کے دھار آج

ہے ارجمند غلام یو اکبر حسین کا
کہتے تمام جگ منے عالم پوکار آج (بیاض ۳ ورق ۶۳)

۴۔ علی رضا:

علی رضا کے مراثی کی سرخی کے طور پر "من کلام علی رضا مرزا حسین" تحریر کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کا پورا نام علی رضا مرزا حسین تھا۔ جیسا کہ اس سے قبل لکھا گیا ہے کہ علی رضا نصیری اور ارجمند کا ہم عصر بارھویں صدی ہجری کا ایک دکنی شاعر ہے۔ افسر صدیقی امروہوی نے "بیاض مراثی" میں علی رضا کے دو مرثیے شائع کیے ہیں۔ ۱۱/ اور ۱۰/ ابیات پر مشتمل ان مرثیوں کے ابتدائی اور اختتامی اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

یاد کر درد شہیداں کا خوشی دور کرو — ہاتھ لے غم کا پھتر، شیشہء دل چور کرو
نت رضا شاہ ترے دکھ سوں ہوا ہے رنجور — روز محشر کوں شفاعت ستی مسرور کرو

سگلے ملک فلک پو او حوراں بہشت میں — کرتے زمیں پو غم دیکھو عالم حسین کا
راضی علی رضا پو اچھو شاہِ اولیاء — اس غم سوں مارتا ہوں سدا دم حسین کا[۶۸]

علی رضا مرزا حسین کے ہم نے تین غیر مطبوعہ مرثیے نقل کیے ہیں، جن میں سے ایک مرثیے کا مطلع اور مقطع قبل ازیں پیش کیا گیا ہے، اس مرثیے کے دوسرے اشعار یہ ہیں:

(۱)

کیوں ظالماں کیے ہیں ستم اس شہاں اپر — عالم ہے اس دکھوں سوں دیکھو زار زار آج
باد خزاں کے غم سوں دیکھو ہر چمن کے گل — پژمردہ ہو پڑے ہیں چتے ٹھار ٹھار آج
حورو ملک یوسن کے خبر چاک کر سنے[۶۹] — جاکر پڑے ہیں غم میں قطاراں قطار آج

(۲)

دیکھو ہلالِ محرم نے آنگن اپرال[۷۰] — بساط غم کا بچھایا ہے تربھون اپرال[۷۱]
ہزار حیف کہ اس وقت جھڑ پڑے کیوں نئیں — ستیا[۷۲] تھا بات دو کافرنے جب دسن[۷۳] اپرال

سر شریف لجاکر سٹے وجود شریف (۲) — کہ جس کا سیر[74] نبی کے اتھا نین اپڑال
نبی کی آل کوں یکر دز میں فنا کرنے — گمر سوار ہوے تھے اجل پون[75] اپرال
علی رضا کا بڑا آرزو ہے اے غازی — کہ یو نین بھی پڑیں گے ترے چرن[76] اپرال

(۱)

گئے اس جہاں سوں شاہ دو جگ ہاے ہاے
جاتی عمر ہماری بلک[77] ہاے ہاے ہاے

اس شاہ دیں کا کیوں کیے سرتن ستی[78] جدا
کرتے ہیں اس دکھوں[79] سوں ملک ہاے ہاے ہاے

اے مومناں کرو تمیں[80] آل نبی کا غم
اس غم سوں خم ہوا ہے فلک ہاے ہاے ہاے

کیوں سرخرو اچھیں[81] گے خدا پاس دو سگاں[82]
سرور کے آل کے[83] ہیں بلک ہاے ہاے ہاے

سرور کا غم یوسن کے جتے[84] وحشی ہور[85] طیور
مارے تہیں پلک سوں پلک ہاے ہاے ہاے

اس جگ سوں ہو[86] بتنگ گئے شاہ دیں حسین
جیوں رعد جاوتا[87] ہے جھلک ہاے ہاے ہاے

شاہان دو جہاں پہ رضا دل سوں ہو فدا
زاری کرے گا حشر تلک ہاے ہاے ہاے

۵-۱ فصیحی بیجاپوری:

افصحی (متوفی ۱۱۶۵ھ) بیجاپور کے مشہور شاعر تھے۔ زوال بیجاپور کے بعد وہ ارکاٹ چلے گئے تھے۔ افصحی حضرت ہاشم حسینی علوی معروف بہ ہاشم پیر کے نواسے اور سید محمد غوث غوثی ارکاٹی کے والد تھے۔ انھوں نے "نو بہار" اور "وفات نامہ" کے نام سے دو مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ افسر صدیقی امروہوی نے "مخطوطات انجمن ترقی اردو۔ کراچی کی پہلی جلد میں ان کی غزل کے چند اشعار نمونتاً پیش کیے ہیں (۸۸) کتب خانہ، سالار جنگ کی ایک قلمی بیاض (بیاض مراثی ۳) سے یہاں افصحی کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ پیش کیا جاتا ہے:

دو گل نبی علی کے پریشاں نکل چلے
زخمی دلاں[۸۹] سوں مرہم ریشاں نکل چلے

تھے فاطمہ کے گل[۹۰] کے پدک وو دو رتن
درجگ تھے جگ رہے .... پنہاں نکل چلے

سورج نبی کے گھن[۹۱] کے چندر[۹۲] فاطمہ کے تھے
بے نور کر جہاں کو شتاباں[۹۳] نکل چلے

قاسم نے نو عروس کو خیمہ میں چھوڑ کر
دل چاک چاک، چاک گریباں نکل چلے

موتی انجو[۹۴] کے بھر کو صدف[۹۵] سار نین میں
پوچھیگا شاہ چھوڑ مجے کاں[۹۶] نکل چلے

سورج .... غم سوں .... کوں اگن لگا
جلنے لگیا ہو شعلہ شہ جاں نکل چلے

.... شہ دیں عروس کوں
انجواں انکھیاں سوں پونجھ کے گریاں نکل چلے

افسوس صد ہزار (جو) اصغر کے حلق (سوں)
پانی نہ پی کو خون کے بونداں[۹۷] نکل چلے

سینے ستی لگا ....
میداں تھے پھر حرم کوں پریشاں نکل چلے

آکر کہے .... معصوم پاک کوں
انگے[۹۸] ہمن کوں چھوڑ کے ہمناں نکل چلے

اہلِ حرم تمام جو دیکھے سو حال تو[۹۹]
بے اختیار انکھیاں سیتی انجواں[۱۰۰] نکل چلے

زینب کوں کر وداع شہ دیں حرم کوں چھوڑ
راضی قضائے حق سوں ہو شاداں نکل چلے

سرور حسین شہ چلے ..... بیٹھ جب
سمنک[۱۰۱] تھے مل[۱۰۲] کے لاکھ سواراں نکل چلے

جب اسپ برق سر تھے ....
گویا کہ تخت چھوڑ سلیماں نکل چلے

کیا حال اچھیگا[۱۰۳] آہ (جو) طفلاں[۱۰۴] حسین کے
جب کربلا سوں ہو کے یتیماں[۱۰۵] نکل چلے

جنت میں ہے امید اسے کوثر کے جام کا
انجواں کے جس انکھیاں ستی موجاں نکل چلے

ماتم سوں افصحی کے نین شمع ہو جلے
کیوں نا جلے جو شمع دل و جاں نکل چلے

(بیاض ۳ ورق ۲۱)

۶۔ عابد ویلوری:

پیش نظر بیاض کے ترقیمے سے پتہ چلتا ہے کہ اس مخطوطے کا کاتب عابد ویلوری ہے اور وہ میر علی رضا عرف تانے صاحب کا فرزند تھا۔ عابد کا پورا نام عابد زین العابدین تھا، جس نے یہ بیاض ۲۷/ ربیع الاول ۱۱۴۱ھ کو بہ مقام ایلور (ویلور) لکھی۔ ترقیمہ درج ذیل ہے:

"کتبہ زین العابدین مغفرت دست گاہ میر علی رضا عرف تانے صاحب تحریر انی التاریخ بست و ہفتم ماہ ربیع الاول ۱۱۴۱ھ من مقام ایلور" (بیاض ۳، ورق ۱۳۷)

یہاں عابد کے پیش نظر مرثیے کی سرخی بھی نقل کی جاتی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ علی رضا اس بیاض کی کتابت سے قبل وفات پا چکے تھے:

"من کلام میر زین العابدین ابن میر علی رضا مرحوم"

غم کی لگی ہے آگ مرے تن بدن کوں آج — نالے کا ہماصدا مرا پہنچا گگن کوں آج
ہنسنے کا ناوں کوئی مرے سامنے نہ لیو — رونا نصیب ہوا ہے ہمارے نین کوں آج
کر کالوسے اپس کے یو دونوں نین کے تئیں — تازہ رکھو یو دکھ کے نہال و چمن کوں آج
از بس تے سوز سوں یو جلیں شمع ہور چراغ — نئیں روشنی یو آگ لگی انجمن کوں آج
کھا زخم جب حسین علی رن منے پڑے — جنت کا عیش تلخ ہوا ہے حسن کوں آج
پڑتے ہیں پانوں ہات میں دکھ تے وحوش سب — وحشت کا نئیں رہیا ہے اثر کچھ ہرن کوں آج
اس غم کی نئیں اٹھی ہے یکیلی دکھن میں آگ — غم کی لگی ہے آگ خطا ہور ختن کوں آج
ہریک انجو کی بوند پیتے دوستاں اِتا — میں واردار کرسٹوں درعدن کوں آج
شمشیر مار مار شہیدانِ نام دار — سب لالہ زار لھو سوں کئے ہیں اگن کوں آج
کوئی لیا سٹیں اگر تو مرے سرا پرسٹوں — جل کر انگار ہوا ہوں جلا کر وطن کوں آج
امید حق سوں، حق کے رسول و وصی کوں ہے — عابد کا روح شبہ کے لگے جا چرن کوں آج

حوالے اور فرہنگ:

(۱) حفیظ صدیقی - کشاف تنقیدی اصطلاحات - مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد - ص ۱۰۰-

(۲) بیاض مراثی نمبر ۳ اور ۴- (۳) تاریخ ادب اردو (جلد اول) ص ۳۸۸ - (۴) ایضاً

(۵) پر (۶) دھانا بمعنی دوڑنا (۷) دکھی (۸) مکھ - چہرہ (۹) جبھا (۱۰) میرے (۱۱) ...

(۱۲) سے (۱۳) لہو - خون (۱۴) نھانا بمعنی نہانا (۱۵) سنڈاپ - عارضی سامان (۱۶) جاند

(۱۷) دیے - چراغ (۱۸) روشنی (۱۹) گھٹ بمعنی مضبوط گھٹ بمعنی گھونٹ

(۲۰) ایک سیاہ پرندہ - سونا (۲۱) جھمکتی ہیں (۲۲) او کی (۲۳) آنسو - اشک (۲۴) بادل

(۲۵) جھرنے - چشمے (۲۶) میرے (۲۷) ڈال دے (۲۸) ڈالا (۲۹) نہیں (۳۰) سے

(۳۱) ڈالا (۳۲) چنگاریاں (۳۳) دل (۳۴) جل اٹھیں (۳۵) چاروں طرف

(۳۶) افسر صدیقی امروہوی - بیاض مراثی - ص ۱۹۵-

(۳۷) پروفیسر غلام عمر خاں - مجلہ تحقیقات اردو (سالنامہ) ۱۹۸۰ء ص ۴۹-

(۳۸) سٹنا بمعنی ڈالنا (۳۹) آگ (۴۰) بجھتے ہیں (۴۱) تھے (۴۲) اسی وقت میٹ دینا

(۴۳) تکتی (۴۴) جو - جو کوئی (۴۵) ہمیشہ (۴۶) سے (۴۷) ایسا بمعنی دینا

(۴۸) ہو - رہے (۴۹) میں (۵۱) رات دن (۵۲) دو (۵۳) جان (۵۴) اپنے (۵۵) ...

(۵۶) آنکھ (۵۷) ہانک کی جمع بمعنی آہ بھرنا (۵۸) رہیں گے (۵۹) تو (۶۰) سے

(۶۱) کسی میں (۶۲) رچنا بمعنی بنانا - ترتیب دینا (۶۳) بہار (۶۴) ... (۶۵) ...

(۶۶) کہاں (۶۷) آپ خود

(۶۸) افسر صدیقی امروہوی - بیاض مراثی - ص ۳۰ تا ۳۲-

(۶۹) سینے - گریبان (۷۰) اوپر (۷۱) کھنوں عالم بمعنی بہشت ، دوزخ اور دنیا

(۷۲) سٹنا بمعنی رکھنا (۷۳) دانت (۷۴) سر (۷۵) پیر (۷۶) سے

(۷۷) بلکنا بمعنی سسکیاں لینا - تڑپنا (۷۸) سے (۷۹) دکھوں کی ... سے

(۸۰) آپ - تم (۸۱) رہیں گے - ہوں گے (۸۲) تک کی جمع - سکے (۸۳) لگتے ہیں

(۸۴) چہتے (۸۵) اور (۸۶) تنگ ہو کر (۸۷) جاتا

(۸۸) افسر صدیقی امروہوی - ملفوظات انجمن (جلد ۱) ص ۴۳-

(۸۹) دل کی جمع (۹۰) گلا (۹۱) آسمان (۹۲) چاند (۹۳) قتاب کی جمع بمعنی جلدی

(۹۴) آنسو کے موتی (۹۵) مانند - طرح (۹۶) کہاں (۹۷) ہند کی جمع (۹۸) آگے (۹۹) تو

(۱۰۰) انجو کی جمع بمعنی آنسو (۱۰۱) سامنے (۱۰۲) سے (۱۰۳) دیکھا - ...

(۱۰۴) طفل کی جمع (۱۰۵) یتیم کی جمع -

شغلی بیجاپوری کا غیر مطبوعہ کلام

شاہ عالم شغلی، عادل شاہی دور کے ایک باکمال صوفی شاعر تھے۔ وہ ۱۰۳۰ھ / ۱۶۲۰ء میں، ابراہیم عادل شاہ ثانی المعروف بہ جگت گرو کے عہد (۱۵۸۰ء۔ ۱۶۲۶ء) میں، بیجاپور میں پیدا ہوئے۔ وہیں کے ایک بزرگ سید شاہ نعمت اللہ قادری سے بیعت ہوئے اور خرقہ، خلافت بھی پایا۔ بیجاپور کے زوال کے بعد شغلی مدراس کے علاقے وڈی گرام پونڈی پہنچے اور وہاں کے ایک مشہور صوفی اور صاحب دیوان شاعر شاہ سلطان ثانی (۱۶۰۹ء۔ ۱۶۸۵ء) کے آگے زانوے ادب تہہ کیا۔ شاہ سلطان ثانی نے انھیں نہ صرف اپنے فیض تربیت سے بہرہ ور کیا بلکہ خرقہ، خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔ شاہ سلطان ہی کے ایماء پر شغلی مدراس کے قصبے تبئ پورم تعلقہ والی کنڈہ ضلع ترچی پہنچے اور مستقل طور پر وہیں قیام پذیر ہو کر رشد و ہدایت اور تبلیغ و اشاعت کا کام انجام دیتے رہے اور ۱۱۱۴ھ مطابق ۱۷۰۳ء میں ۸۳ سال کی عمر میں اسی مقام پر داعی اجل کو لبیک کہا۔ شغلی کے ایک ہم عصر شاعر اور پیر بھائی شاہ صادق ارکاٹی نے "غاب قطب" سے ان کی تاریخ وفات نکالی۔ قطعہ تاریخ وفات درج ذیل ہے:

شاہ عالم آں ولی، ماورائے عقل و نقل
از فنا گم گشتہ، از باقی ندارد ہیچ فصل
گفت صادق شاہ از روئے عقیدت مصرعے
تاکہ جوئی اندریں "غاب قطب" تاریخ وصل

شاہ عالم شغلی صرف شاعر ہی نہیں بلکہ اپنے زمانے کے بلند پایہ عالم بھی تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ "شاہ عالم گیانی" اور "ہادی الشعراء" کے لقب سے بھی جانے پہچانے جاتے تھے۔ شغلی کی تصانیف میں درج ذیل کے نام ملتے ہیں:

۱۔ دیوان شغلی ۲۔ مثنوی پند نامہ ۳۔ نظم وحدت ۴۔ ایک قصیدہ

اور ایک قطعہ (۲)۔
راقم السطور نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تحقیق کے سلسلہ میں شغلی کے دیوان کے نادر ونایاب قلمی نسخے (مملوکہ مولوی احمد خاں درویش مرحوم) سے استفادہ کیا تھا اور بیس پچیس غزلیں نقل کی تھیں، جن میں سے ۱۱/ غزلیں ماہنامہ سب رس "حیدرآباد (بابتہ جون ۱۹۸۵ء) میں شائع ہو چکی ہیں (۳)۔ پیش نظر مضمون میں شغلی کی مزید آٹھ غیر مطبوعہ غزلیں تدوین متن کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ شغلی ایک قادر الکلام شاعر تھے، ان کے کلام میں صوفیانہ تجربات کی حرارت بھی ملتی ہے اور عشقیہ جذبات کی رنگینی بھی:

(۱)

ہوا ہے عشق کا غلبہ تو اب اس کوں دبانا کیا
اپس[4] تے آپ بھڑکا[5] ہو اٹھا ہے تو بجانا[6] کیا

بجائے تو بُئی بوجے[8] نا اگن[9] دریا کوں لاگے تو
دبائے تو بھی دبے نا،[10] اگن روئی میں دبانا کیا

ہے مانند روئی کے منجہ دل،[11] دھڑکتی نہہ اگن[12] تلتل[13]
نہاں تے[14] ہربیاں میں مل، عیاں ہوتی بتانا کیا

نہاں میں جو اتھا[15] سورب، عیاں میں ہے ابد ہو اب
عیاں پنہاں کوں سمجا[16] جب، تو بس ہے جی پھرانا[17] کیا

عیاں کے تئیں بیاں کیا ہے، بیاں کے تئیں نہاں کیا ہے
نہاں کے تئیں زباں کیا ہے، زباں ہے تو ہلانا کیا

ہلائے بن زباں کے تئیں، وقر[18] معلوم ہوتا نئیں
تو اب واجب ہے میرا میں، مرم[19] کہنا چھپانا کیا

چھپے اسرار کا دفتر، سنوارے سالکاں[20] دل دھر[21]
سنن ہے عشق تو بہتر، عشق نئیں تو سنانا کیا

عشق اول عشق آخر، عشق ظاہر عشق باطن
عشق یا ہو، یامن ہو ہے لاشک آزمانا کیا

عشق ہے ذات اشکارا، عشق خلقت لیا سارا
لذت ہر شئے چکھن ہارا،[21/1] تجھا دیکھو[22] دکھانا کیا

عشق عاشق عشق محبوب، عشق عاقل عشق مجذوب
عشق طالب عشق مطلوب عشق ہادی ہے جانا کیا

عشق[23] بن تئیں ہنر دوجا، عشق کوں کوئی یک بوجا
جنے[24] بوجا سو بت پوجا، سیانا کیا دیوانا کیا

دیوانہ او ہوا الحق، پیالے عشق کا مطلق
ہو عاشق بت اوپر شق شق، وصل پایا تو پانا کیا

وصل بعد ... شق شق[25]، جو حلقہ مارکر لق لق
جہاں کتیں (ہو) اناالحق حق، تہاں دوئی کوں لیانا[26] کیا

جو دوئی کا چھوڑدے پیشہ محیطی لے رہے گوشہ
چکھے او محبت توشہ، طلب باقی لجانا کیا

جو کوئی محبت ملنگے، سو او رہ عشق کی لاگے
رکھے ثابت قدم آنگے،[27] تو پھر پیچھے ہٹانا کیا

اگر رہ عشق کی منگتا، بیا ید پیش آشفتہ
دوئی بگذار شویکتا، ایتا[۲۸] لیتا ہے بھانا[۲۹] کیا

دوئی کا چڑھتے ہو تودا، عبث ڈھونڈتا طبق چودا
یہاں حاضر ہے اور سودا ولے دے گا بیانا[۳۰] کیا

بیانا سیس[۳۱] دینا ہے، تو تب[۳۲] سودا او لینا ہے
وگرنہ جنم کھونا ہے پچھے پچتائے[۳۳] ہونا کیا

صنم ہونا تو سر دینا، ہو شغلی شغل لے رہنا
صفت کوں ذات کر گمنا،[۳۴] عمر ناحق گنوانا کیا

(۲)

اللہ رسول میانے، قراں ہوا ہے ثالث
جیوں دو نین کے اندر ثالث نظر ہے خوش تر
قاضی، وکیل اندر، ثالث گوا ہے اکثر
جیوں مرد ہور زن میں، ثالث پسر انگن میں
معشوق عاشق اندر ثالث ہے عشق گوہر
جنت سقر کے میانے ثالث ہے بول جانی

جوں خوف ہور رجا میں ایماں ہوا ہے ثالث
کونین بیچ جوں ور یوزر ہوا ہے ثالث
جیوں در عروس شوہر (انتر) ہوا ہے ثالث
جیو دھرتری گگن میں، اوسط ہوا ہے ثالث
اسلام کفر میں ور، فقر ہوا ہے ثالث
ذات و صفت بچھانے، شغلی ہوا ہے ثالث

[اس غزل میں قوافی غیر منظم ہیں]

(۳)

تجہ مکھ کنول پہ جیو مجہ پھرتا ہے ہو بھنور چرخ
گویا قطب تارے اپر پھرتا ہے جیوں انبر چرخ

کرموں سیاہ جگ میں سگل یوں ڈھونڈتا تیرا وصل
سورج کے سایہ بدل پھرتا ہے جیوں چندر چرخ

کرتا ہے پھر تیرا ورد انکھیاں اوپر بندا سر
جوں بیل گھانے کے گرد پھرتا ڈگاں دھر دھر چرخ

محبوب توں بستا ہے کئیں، یوں برہ لے پھرتا ہوں میں
جوں رہٹ لے پانی کے تیں، پھر گھیریاں پھر پھر چرخ

برہا بھجنگ ہو مجہ پڑے، سرپرتے یوں انچل اڑے
چرخیاں تے جوں چنگیاں جھڑے، پھرتے وقت سرسر چرخ

تجہ ..... لے کر، مجہ دل پھرے یوں اے سندر
جوں ہات کی ڈوری اوپر، چکر پھرے شرشر چرخ

تجہ بن ہے مجہ دل دربدر، کر وصل کی تس پر نظر
یوں دل چرخ ہے تن اندر، چرخا ہے جوں گھر گھر چرخ

شغلی ہوئے چودا طبق، تجہ شغل میں پھرتے عرق
پھرتے مقوے کے ورق، تاراں میں جوں تھر تھر چرخ

(۴)

خوباں جتے دنیا منے دیکھیا وتے سیار رخ
کوئی نہ تھے جگ میں جتے، تجہ تے میٹھے خمار رخ

میں تربھون چارو کدھن، سب انجمن دیکھیا موہن
نئیں تجہ نمن، شیریں سخن صاحب حسن دلدار رخ

برو بحر شہرے شہر، لیتا خبر میں اے سندر
نئیں کوئی بشر تجہ سا بشرلے دربدر جھلکار رخ

پھر پھولبن توں اے موہن، کسوت[35] چمن سرو بدن
کنول دہن بھنور نمن، نرگس نین گل زار رخ

کر تاز خوش تن ساز خوش، کئی راز خوش کچہ واز خوش
اے ناز خوش، نہہ باز آواز خوش گفتار رخ

خشکی تری نازوں بھری، نیں استری جیوں کوئی پری
کسوت کرے زیور زری، مروت دھرے سنگار رخ

شغلی شغل لیتا سگل، پھرتا بیکل تیرے بدل
توں دے وصل ذاتی اصل، نوری پھل دیدار رخ

(۵)

ہرنور کے چنگیاں اگل[36] تارے یو اسمانی کدر[37]
تس نور کے رنگاں اگل، یو ابر افشانی کدر

چودا طبق ایکچ[38] ہو، شعلہ جہاں دستا وہاں
شمس و قمر توکس گنت[39]، کہہ طور نورانی کدر

معشوق کے کونچے منے، بن سر دیے چارہ نہیں
ہستی کوں مارامار ہے واں بغض سلطانی کدر

دیدار[40] کے مشتاق ہو، عاشق جہاں ٹھارے اہیں
عامل کوں لاٹا لاٹ ہے واں خلق نفسانی کدر

مذہب محیطی کا پکڑ بت سوں جتنے گتا اہے
تس کے اگل یو مذہباں، کفر و مسلمانی کدر

العلم نکتہ ہے جہاں بستار[۴۱] ہوتا نئیں وہاں
عارف ہوے گنگے[۴۲] وہاں گفتار عرفانی کدر

بت علم کا ہے یو شرف، آواز نا اس کوں حرف
واں سب کتاباں[۴۳] برطرف، تفسیر فرقانی کدر

بت وجہ کے مکتب منے شغلی درس پڑتا[۴۴] جہاں
واں عالماں ہور زاہداں پرماتما[۴۵] گیانی کدر

(۶)

تجہ وجہہ[۴۶] نورانی اگل مہتاب اعیانی[۴۷] کدر
تجہ حسن کے شعلے اگل، خورشید تابانی کدر

تجہ سیس[۴۸] کے بالاں اگل، قربان ہیں کالاں[۴۹] سگل[۵۰]
مقبول ہے کیا دراصل، بھنورے پریشانی کدر

ہیں خوش پٹیاں تجہ بھاگ کے، قربان ہیں پھن ناگ کے
دو بازواں ہیں کاگ کے، ھور ابربارانی کدر

تجہ زلف تو خوش نام ہے، قربان تس پر لام ہے
صیاد کا کیا دام ہے، زنجیر زندانی کدر

تجہ مانگ سکتا[۵۱] کن برن[۵۲]، قربان ہے چندر کرن
اڑگن[۵۳] لگی رے کس کنن ھور تیغ بربانی کدر

مقبول ہے کاناں اپر، قربان ہے آدھا چندر
دریا میں سیپیاں سربسر ھور صدق درانی کدر

یوں تجہ پٹیاں کا ہے صفت ہے روپ کا گویا تخت
تمثیل بعضے کس گنت ہور غیر و اسمائی کدر ؟

دستے ہیں یوں تیرے بھنواں[۵۵]، امداد مانگے کا تباں[۵۴]
قرباں ہیں سب خنجراں ہور قوس ملتانی کدر

تیرے سلونے نین پر، صدقہ کنول، ماہی دگر
قربان کھنجن[۵۶] سربسر، ہور ہرن جولانی کدر

مقبول تجہ مژگان ہے صدقہ مدن کے بان ہے
سونار پر قربان ہے ہور تیر پیکانی کدر

مقبول تجہ رخسار ہے، زری ورق ناچار ہے
پھانکاں[۵۷] کنول کے خوار ہے، مرآت سلطانی کدر

میٹھے رسیلے تجہ ادھر[۵۸]، صدقہ کندوریاں تجہ اپر
مونگا بچارا دربدر، ہور لعل سیلانی کدر

مقبول تجہ دندان ہے گیند کے کلیاں حیران ہے
موتیاں تو سب قربان ہے ہور تخم رمانی کدر

قربان تجہ آواز پر، یک بین ہور مرلی دگر
کوئل تو رد ہے سربسر، داؤد الحانی کدر

تیری زنخ دلبند ہے صدقہ سیچ یوں گند ہے
ہور سیب میں کیا چھند ہے، مونجل بیابانی کدر

زنخداں خوش نام ہے، تمثیل کوں تو خام ہے؟
خمشید کا رد جام ہے، جزم فرقانی کدر

قربان تجہ گردن اپر یک فاختہ قمری دیگر
صدقہ کبوتر سربسر طاؤس رقصانی کدر

(۷)

۵۹
اے دوست علم چھوڑ توں، یک عشق حرف خذ
دو جگ کی طمع توڑ توں، اب وصل شرف خذ

جو آپ کوں بوجیا[۶۰] سو صحی[۶۱] رب کوں او بوجیا
یوں بولے نبی، تجہ ہے طلب سو، اوعرف خذ

ہادی نے جگ[۶۲] تجہ کوں دیا راز رتی[۶۳] ایک
او ایک ریتج[۶۴] گنج ہے، در صدق طرف خذ

تجہ تن میں ہے تو برہ جلن کھا تو یو ترکیب
در پیالہ چشم ہر دو وقت نور برف خذ

ہو شغلی صنم سات[۶۵] شب و روز مشغولات
در محل محویات شغل ذات طرف خذ

(۸)
(ریختی)

محیطی ہوی مجہ جب تے یگانا کیا بگانا[۶۶] کیا
ڈسیا[۶۷] یکساں مجے تب تے سیانا کیا دوانا کیا

پیا صورت نین آئی، ہو پھولا نین پرچھائی

نظارہ سوں نظر دھائی، بجھانا[69] کیا، دکھانا کیا

پیا کے بچن کے گوہر، ہوے ہیں گنج کانوں بھر
سماے نا سخن دیگر، تو گانا کیا بجانا کیا

صفت پیو کی زباں پر آ، لذت کے گنج مارے لیا
کجا لذت دیگر اونجا، تو کھانا کیا پکانا کیا ؟

پیا مجہ دست دیتے جب، ہوا اننّد[71] روں روں[72] سب
تو کاں[73] آتا ہے واں دکھ اب، بھلانا کیا رجھانا کیا

ملی ہوں مست مدماتی[74]، پیا شغلی کوں لاچھاتی[75]
کہاں دوتن کہاں ساقی[76] بلانا کیا، لجانا کیا

حوالے و فرہنگ:

مطبوعہ "سب رس" حیدرآباد اکتوبر ۱۹۹۶ء

(۱) دکنی شاعری تحقیق و تنقید (محمد علی اثر) ص ۸۷

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مضمون "شاہ عالم شغلی اور اس کا غیر مطبوعہ کلام" مشمولہ دکنی شاعری تحقیق و تنقید (محمد علی اثر)

(۳) شغلی کی یہ غزلیں راقم الحروف کی مؤلفہ کتاب "دکنی شاعری تحقیق و تنقید" میں بھی شامل ہیں ص ۸۹

(۴) خود سے - اپنے آپ (۵) شعلہ (۶) بجھانا (۷) بھی (۸) بجھ نہیں سکتی (۹) آگ (۱۰) دب نہیں سکتی (۱۱) میرا دل (۱۲) محبت کی آگ (۱۳) لمحہ لمحہ (۱۴) سے (۱۵) تھا (۱۶) سمجھا (۱۷) دہرانا (۱۸) بڑائی - عظمت (۱۹) حقیقت (۲۰) سالک کی جمع (۲۱) توجہ کے ساتھ - دل جمعی کے ساتھ (۲۱/۱) چکھنے والا (۲۲) بہ غور (۲۳) سمجھا - بوجھا (۲۴) جس نے (۲۵) ٹوٹ کر (۲۶) لانا (۲۷) آگے (۲۸) اتنا (۲۹) بہانا (۳۰) بیچانا (۳۱) سر (۳۲) بعد کو (۳۳) بچھتاے (۳۴) بسر کرنا (۳۵) لباس (۳۶) سامنے (۳۷) کدھر (۳۸) ایک ہی (۳۹) کس شمار میں (۴۰) ہیں

(۴۱) پھیلاؤ (۴۲) گونگے (۴۳) کتاب کی جمع - کتابیں (۴۴) بڑھتا (۴۵) اعلیٰ روح
(۴۶) چہرہ - شکل (۴۷) آنکھ کی جمع (۴۸) سر (۴۹) کالا کی جمع بمعنی ناگ (۵۰) تمام
(۵۱) کون (۵۲) زیور (۵۳) ستاروں کا مجموعہ (۵۴) دکھائی دیتے (۵۵) کاتب کی جمع
(۵۶) ایک سیاہ پرندہ (۵۷) شاخیں (۵۸) ہونٹ - لب (۵۹) لے لے - حاصل کر
(۶۰) پہچانا (۶۱) صبح (۶۲) جو کچھ (۶۳) عشق و محبت (۶۴) عشق ہی (۶۵) ساتھ
(۶۶) بے گانہ - غیر (۶۷) دکھائی دیا (۶۸) دھانا بمعنی بھاگنا (۶۹) غور سے دیکھنا
(۷۰) سخن - بول (۷۱) خوشی (۷۲) رواں رواں - بال بال (۷۳) کہاں (۷۴) محبت کی
دیوانی (۷۵) لانا بمعنی لگانا (۷۶) ساتھی - دوست

* محیطی کا لفظ تصور وحدت الوجود کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے -

○ ○ ○

ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرہ مخطوطات

ڈاکٹر زور جامعہ عثمانیہ کے ان نام ور اور قابلِ فخر فرزندوں میں شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے اپنی بے پناہ تحقیقی و تدریسی اور تنظیمی صلاحیتوں کے ذریعے کم و بیش چار دہوں تک اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ وہ اپنی ذات میں ایک فرد یا انجمن ہی نہیں بلکہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ تاریخ ادب اردو میں ان کی ہمہ جہت، متنوع اور رنگارنگ شخصیت ایک مینارۂ نور کی طرح ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔ وہ بیک وقت اردو کے ایک صاحب نظر نقاد، بلند پایہ محقق، ماہر دکنیات، ماہر لسانیات ہونے کے علاوہ ایک مؤرخ، مدون، مرتب، مدیر، شاعر اور افسانہ نگار بھی تھے۔ مختلف موضوعات پر انھوں نے چار درجن سے زائد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی اولوالعزمی صرف صفحہ۔ قرطاس تک محدود نہیں، وہ ایک باعمل اور فعال شخصیت کے مالک بھی تھے۔ انھوں نے ایک طرف، ایک پروفیسر، ایک پرنسپل اور ایک صدر شعبہ کی حیثیت سے سینکڑوں تشنگانِ علم کی پیاس بجھائی تو دوسری طرف، ساہتیہ اکیڈمی، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی، رسالہ "آج کل" اور نہ جانے کتنے ہی علمی، ادبی اور تحقیقی اداروں کے مشیر اور سرگرم کارکن کی حیثیت سے اردو کی بقا اور فروغ کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔

اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں ڈاکٹر زور نے یوں تو متعدد کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں لیکن ادارۂ ادبیاتِ اردو کی تاسیس اور فروغ ان کی زندگی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر زور کے علمی و ادبی فتوحات اور ان کی کامیابی و کامرانی میں ان کی تنظیمی صلاحیتوں کا بڑا دخل ہے۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں سے سرفراز کیا تھا۔ اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے انھوں نے نہ صرف اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا بلکہ اپنے اطراف خلوص اور ذمے داری

کے ساتھ کام کرنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بھی بنالیا تھا۔ بقول سید حرمت الاکرام "انھوں نے (ڈاکٹر زور) نے اپنی منصبی مصروفیات کے متوازی، مضامین اور کتابیں لکھنے، دکنی ادب پر تحقیق کرنے، مخطوطات حاصل کرنے، انھیں مرتب کرنے، دوسروں سے مضامین اور کتابیں لکھوانے، ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالنے اور "سب رس" کو فروغ دے کر، ایک ادبی اور علمی جریدے کے سانچے میں ڈھالنے۔ نیز پے درپے مشکلات کا مقابلہ کرکے "ایوان اردو" کا سنگ بنیاد رکھنے اور اس کی تعمیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے جو کارنامے انجام دیے ان کے پیش نظر یہ تسلیم کرنا اور کہنا پڑتا ہے کہ زور نے اردو کے لیے صرف شاعرانہ الفاظ میں نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اپنا لہو دیا" (۱)۔

ڈاکٹر زور دکنی اور دکنیات کے سب سے بڑے عاشق اور پرستار تھے۔ انھیں دکنی ادب سے ہی نہیں بلکہ دکن کی ہر چیز سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ سرزمین دکن سے تعلق رکھنے والے باکمال شاعروں اور ادیبوں کی نگارشات کے علاوہ دکن کی ہر چیز کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرلیا جائے چناں چہ اس مطمح نظر کے حصول کے لیے وہ تاحیات کوشاں رہے۔ اس سلسلہ میں ان کے وہ مضامین اور مقالے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، جن میں انھوں نے متعدد معروف اور غیر معروف اہل قلم کی نگارشات کو دنیائے ادب سے متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔ ان مضامین میں زور صاحب کی محققانہ ژرف نگاہی، عالمانہ بصیرت اور ناقدانہ نکتہ سنجی اپنے بام عروج پر نظر آتی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو ادارے کے ذخیرۂ نوادرات کو انھوں نے قدیم بادشاہوں کے فرامین، یادداشتوں، پروانوں، دستاویزوں، احکام، اسناد، سکوں، کتبوں اور مہروں، تصویروں، وصلیوں اور خطاطی کے نمونوں سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ قلمی کتابوں کے حصول کے سلسلہ میں انھوں نے راستے کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے، دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور اس کے صلہ میں سینکڑوں بیش بہا اور انمول مخطوطات جمع کیے۔ ڈاکٹر زور نے نہ صرف دکنی اردو کے قدیم ادبی مراکز گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، اورنگ آباد وغیرہ سے شخصی طور پر قلمی کتابیں حاصل کیں بلکہ ریاست حیدرآباد کے باہر بھی اپنے آدمی بھیج بھیج

کر، مذہبی خانقاہوں، درگاہوں، درس گاہوں، عبادت گاہوں اور اہلِ علم گھرانوں سے بے شمار قلمی نوادر اکٹھا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

جہاں تک ڈاکٹر زور کی مرتبہ قلمی کتابوں کی توضیحی فہارس کا تعلق ہے، یہ ان کا ایک عدیم المثال تحقیقی کارنامہ ہے۔ تلاش و تحقیق کی دشوار گزار منزلیں طے کرتے ہوئے محقق کو کیسی جاں فشانی اور عرق ریزی سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اسے وہی لوگ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جنھیں اس ہفت خواں کے طے کرنے کا موقع ملا ہو۔ سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے سیپیاں، مرجان اور موتی نکال لانا بے شک ایک بہت بڑا کام ہے۔ لیکن ان موتیوں کو جانچنا، پرکھنا اور پھر ان کی قدر و قیمت کا تعین کرنا اس سے بھی بڑا کام ہے۔ ڈاکٹر زور نے ایک صاحبِ بصیرت پارکھ اور مخطوطہ شناس کی حیثیت سے قدیم اردو ادب کے نادر و نایاب مخطوطات کو اہلِ علم کے سامنے پیش کر کے تاریخِ ادبِ اردو میں ڈھائی تین صدیوں کا اضافہ کیا ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کا کتب خانہ۔ عربی، فارسی، اردو اور خصوصاً دکنی کے ذخیرۂ مخطوطات کے اعتبار سے دنیا کے چند اہم اور قابلِ فخر کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ اس کتب خانے میں محفوظ ایک ہزار چار سو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرستیں چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ایک ہزار ایک سو پچاس مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں پانچ جلدوں میں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیان شائع کیں۔ پانچویں جلد کی اشاعت کے چوبیس سال بعد ۱۹۸۳ء میں محمد اکبرالدین صدیقی مرحوم اور راقم الحروف کے اشتراک سے چھٹی جلد کی اشاعت عمل میں آئی۔

ڈاکٹر زور نے اپنی ذاتی سعی و کاوش اور خصوصی توجہ کے ذریعے ادارۂ ادبیاتِ اردو میں اردو، فارسی، عربی اور ہندی کے پانچ ہزار سے زیادہ مخطوطات جمع کیے۔ ان کی مہم پسند طبیعت نے انھیں صرف قلمی نوادر یکجا کرنے کی طرف ہی راغب نہیں کیا بلکہ ان مخطوطات کی توضیحی فہرستیں رقم کرنے کی جانب بھی اکسایا۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے قلمی کتابیں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ زور صاحب نے ان فہارس کو مرتب و شائع کر کے نہ صرف اردو کے متعدد غیر معروف اور گوشۂ گم نامی میں چھپے ہوئے اہلِ قلم کو متعارف

کروایا ہے، بلکہ ادارے سے استفادہ کرنے والوں کے امکانات کو بھی وسیع تر کر دیا ہے۔اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ کسی بھی زبان کے قلمی نسخوں کی توضیحی فہرستیں بنیادی کتب حوالہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔اور ان سے استفادہ کئے بغیر کوئی بھی تحقیقی کام نامکمل اور ادھورا رہے گا۔ادارۂ ادبیات اردو میں دکنی اردو کے مخطوطات کا قابل لحاظ ذخیرہ محفوظ ہے اور جہاں تک دکنی ادب کی چھان بین اور تلاش و تحقیق کا تعلق ہے، یہ ایک ایسا دشت بیکراں ہے، جس کی سیاحی میں راستے کی صعوبتیں اور کٹھن مرحلے اور بھی زیادہ درپیش ہوتے ہیں۔قدیم مخطوطات کے سمندر کی غواصی کرکے انمول موتی منظر عام پر لانا کوئی آسان کام نہیں۔بقول ڈاکٹر زور:

> "تذکرۂ مخطوطات" کی ترتیب کے سلسلہ میں مؤلف کو جو زحمتیں اٹھانی پڑی ہیں اور جو وقت صرف ہوا ہے اس کا اندازہ وہی اصحاب کر سکتے ہیں جنھیں قلمی نسخوں سے کام لینے کا تجربہ ہو۔اگر مخطوطوں کے مصنفوں کے نام سنہ یا زمانہ۔تصنیف اور زمانہ۔کتابت وغیرہ کی تحقیق میں بیسیوں قلمی و مطبوعہ کتب کی ورق گردانی کرنی پڑی اور بڑا وقت صرف ہوا" (۲)۔

ڈاکٹر زور کو دکنی مخطوطات کو پرکھنے اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے علاوہ انھیں روانی سے پڑھنے کا بھی غیر معمولی ملکہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ دکنی شعراء اور ادیبوں کے بارے میں ان کے بیانات استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔

"تذکرۂ مخطوطات" کی پہلی جلد ۱۹۴۳ء میں ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے پہلی بار شائع ہوئی ۳۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں دو سو پچھتر مخطوطات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔۱۹۸۴ء میں اسی جلد کا عکسی ایڈیشن ترقی اردو بیورو دہلی کی جانب سے منظر عام پر آیا۔حال ہی میں راقم الحروف نے استاد محترم پروفیسر مغنی تبسم کے زیر نگرانی تذکرۂ مخطوطات کی پہلی جلد کو ترمیم و اضافے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔یہ کتاب اشاعت کے آخری مراحل میں ہے۔ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ اس جلد میں پچھتر مخطوطات ایسے ہیں، جن کا کوئی اور نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے علاوہ کسی اور کتب

خانے میں نہیں ملتا (۳)۔پچاس قلمی کتابیں خود مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں یا ان پر ان کے دست خط ثبت ہیں۔اس جلد میں متعدد ایسے قلمی نسخے بھی ہیں جو اب تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوسکے۔اس کتاب میں قدیم دکنی شعراء اور ادیبوں کے مخطوطات کے علاوہ شمالی ہند کے مصنفین کی قلمی کتابیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں (۴)۔ڈاکٹر زور نے نہ صرف ہر مخطوطے کا مختصر خلاصہ پیش کیا ہے بلکہ مصنف کے واقعات حیات، کتاب کی ادبی قدر و قیمت اور اس کے ماخذوں پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے اور ممکنہ حد تک دیگر نسخوں کی نشان دہی بھی کر دی ہے۔یہ کام بڑی جگر کاوی اور جاں فشانی کا تھا جسے زور صاحب نے محققانہ دروں بینی اور ناقدانہ نکتہ سنجی کے ساتھ دل کش اسلوب میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔اس تذکرے میں ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء اور ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء کے درمیانی زمانے سے تعلق رکھنے والی قلمی کتابوں کی تفصیل محفوظ ہوگئی ہے۔کتاب میں مطعین مخطوطات کے اسمائے گرامی اور اشاریے کے علاوہ موضوع کے اعتبار سے مرتب کی ہوئی فہرست بھی شامل ہے۔تذکرۂ مخطوطات کی جلد اول کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس میں شامل بعض مخطوطات "فرماں رواوں جیسے محمد قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ، علی عادل شاہ ثانی والئی بیجاپور، عبداللہ قطب شاہ والی حیدرآباد، واجد علی شاہ والی لکھنو اور نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے رشحات قلم ہیں" (۵)۔

تذکرۂ مخطوطات کی دوسری جلد، جلد اول کی اشاعت کے آٹھ سال بعد ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔اس میں عربی کے ۴۸ فارسی کے ۲۵۰، اردو کے ۲۵۱ اور ہندی کے ۵ اس طرح جملہ ۵۵۴ مخطوطات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔پہلی جلد کے مقابلے میں اس تذکرۂ مخطوطات کی ترتیب کا کام ڈاکٹر زور نے بہت رواروی اور عجلت میں کیا ہے۔ چناں چہ اس کتاب کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے:

> "۱۹۴۳ء میں جو تذکرۂ اردو مخطوطات شائع ہوا تھا، اس میں مخطوطوں پر تفصیلی اور تقابلی نظر ڈالی گئی تھی۔اب نہ اتنا وقت تھا اور نہ اگلی سی صحت اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ کم سے کم وقت اور محنت میں زیادہ مخطوطات کا ایک اجمالی تذکرہ قلم بند ہوجائے اس مقصد کو

پیش نظر رکھ کر تذکرۂ مخطوطات کی یہ دوسری جلد مرتب کی گئی ہے۔
اس میں ۵۰۰ سو قلمی کتابوں کی تفصیلات پیش نظر ہو گئی ہیں" (۶)۔

ڈاکٹر زور کی دیگر مصروفیات اور عجلت پسندی کے باوجود تذکرۂ مخطوطات کی دوسری جلد کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں ۱۴ مخطوطات ایسے ہیں جن کے مصنفین ہندو ہیں اس طرح ہندو کاتبوں کی تعداد ۲۳ ہے اور ۱۴ قلمی کتابیں قدیم ہندی اور سنسکرت تصانیف کے ترجموں پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب میں دو درجن کے قریب مخطوطات ایسے ہیں جن کی کتابت ۷۳۷ ھ / ۱۳۳۶ء اور ۱۰۰۰ ھ / ۱۵۵۱ء کے درمیانی زمانے میں کی گئی اور تقریباً ایک درجن قلمی کتابیں عمدہ کاغذ، بہترین نقش و نگار اور خطاطی کے اعلا نمونوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ غالباً یہ تمام نسخے کسی شاہی کتب خانے کی زینت بن چکے ہیں۔

جلد اول کی طرح "تذکرۂ مخطوطات" کی دوسری جلد میں بھی عطیہ دہندہ گان کے اسمائے گرامی اور اشخاص، کتب اور مقامات کا اشاریہ بھی شامل ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اتچ۔ ای۔ اتچ۔ دی نظامس اردو ٹرسٹ کی اعانت سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا جو ۱۷۶ صفحات پر محیط ہے۔ اس کتاب کا تیسرا اور عکسی ایڈیشن ترقی اردو بیورو دہلی کی جانب سے ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔

تذکرۂ مخطوطات کی دوسری جلد کی اشاعت کے چھ سال بعد ۱۹۵۷ء میں تیسری جلد چھپی۔ یہ کتاب ۳۹۰ صفحات اور ۲۰۰ قلمی نسخوں کی توضیحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں متعدد ایسے صاحب دیوان شعراء کا تذکرہ اور نمونہ۔ کلام درج ہے، جن کے نام یا تخلص سے بھی اردو دنیا ناآشنا تھی۔ مثلاً فدوی اورنگ آبادی، مفتون اورنگ آبادی واجد دہلوی، شہوار، مظفر، اشفاق، انور وغیرہ۔ بعض ایسے شعراء اور ادبا کی نگارشات بھی اس جلد کی زینت ہیں۔ جن کی تصانیف سے اردو دنیا ناواقف تھی۔ اس کتاب میں بعض ایسے بیش بہا مخطوطات کا بھی تذکرہ شامل ہے، جن کے مطالعہ سے حیدرآباد کی سماجی۔ تہذیبی اور علمی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ جیسے "ماہنامہ۔ جوہر"، تفسیر تنزیل (۷) وغیرہ۔ تذکرۂ مخطوطات کی تیسری جلد میں بھی، زور صاحب نے معطین مخطوطات کی فہرست اور اشاریے کے علاوہ تینوں جلدوں کے عربی، فارسی، ہندی اور اردو

مخطوطات کی اجمالی فہرست شامل کتاب کی ہے۔اس کا دوسرا عکسی ایڈیشن ترقی اردو بیورو کی جانب سے ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔

تذکرۂ مخطوطات کی چوتھی جلد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی، ۲۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۲۰۰ قلمی کتابوں کی توضیح کی گئی ہے۔اس جلد میں بھی تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے متعدد نئے مخطوطات اور ان کے مصنفین کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔اس جلد کے مندرجات میں بھی ابتدائی تینوں جلدوں کا اتباع کیا گیا ہے۔اس کتاب کا دوسرا عکسی ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں ترقی اردو بیورو کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا۔تذکرۂ مخطوطات کی دیگر جلدوں کے مقابلے میں چوتھی جلد کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں اعلیٰ درجے کی خوش نویسی کے نمونوں کی توضیحات محفوظ ہو گئی ہیں۔اس جلد کے مخطوطات نمبر ۸۹۲ تا ۸۹۹ ایسے نادر و نایاب اور بیش بہا نسخے ہیں جن کی خطاطی سورت کے محمد زاہد علی ولد حسن محمد نے کی ہے جو اعلیٰ پایہ کے خطاط تھے۔ڈاکٹر زور نے اطلاع دی ہے کہ "ان کے فرزند محمد صابر کو آصف جاہ اول نے داروغہ جواہر خانہ اور بعد کو "صابر خاں" خطاب دے کر کرناٹک کا صوبہ دار بھی بنایا تھا (۸)۔

خطاطوں کا تذکرہ چل نکلا ہے تو یہاں اس بات کا انکشاف بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ادارے میں مشہور زمانہ خطاط شاہ محمد مومن، محمد آعظم بہادر شاہی، محمد کاظم گیلانی اخلاص رقم، محمد تقی ولد محمد مومن اعظم شاہی کی خوش نویسی کا ایک البم بھی محفوظ ہے جسے امیر رستم میراں نے ۱۱۱۵ھ میں تیار کروایا تھا اس قلمی بیاض میں خطاطی کے مختلف نمونے متعدد اعلیٰ پایہ کے خطاطوں اور خوش نویسوں سے لکھوائے گئے ہیں۔بقول ڈاکٹر زور اس کا ہر صفحہ "وصلی کے طور پر نیلی اور سرخ جدولوں کے درمیان طلائی کام سے مزین کیا گیا ہے" (۹)۔اسی طرح اس جلد میں متعدد قلمی بیاضوں اور مخطوطوں کی توضیح کے درمیان ڈاکٹر زور نے جگہ جگہ شمالی اور جنوبی ہند کے اعلیٰ پایہ کے خطاطوں اور خوش نویسوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں ان کا یہ بیان ادارۂ ادبیات اردو سے وابستہ اہل علم و دانش کو آج بھی دعوت فکر دیتا ہے کہ:

"اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ دکن کے خوش نویسوں کے جتنے شاہکار ادارے میں محفوظ ہیں اتنے کسی اور ایک ہی کتب خانے میں [خواہ وہ سالار جنگ میوزیم ہو یا کتب خانہ۔ آصفیہ (اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری) یا رکارڈ آفس ہو (آرکائیوز)] موجود نہیں ہیں" (۱۰)۔

چوتھی جلد کے منظر عام پر آنے کے ایک سال بعد ہی ڈاکٹر زور نے ۱۹۵۹ء میں تذکرۂ مخطوطات کی پانچویں اور ان کی مرتبہ آخری جلد شائع کی۔ ۳۴۶ صفحات پر پھیلی ہوئی اس ضخیم جلد میں ۲۵۰ قلمی کتابوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس وضاحتی فہرست میں ڈاکٹر زور نے قلمی کتابوں کی خصوصیات کا "اگر چہ کہ مفصل جائزہ لیا ہے تاہم مصنفین کے واقعات حیات کے سلسلہ میں صرف ماخذوں کی نشان دہی کی ہے سچتاں چہ وہ لکھتے ہیں۔" پانچویں جلد میں بھی مخطوطوں کی خصوصیات پر زیادہ زور دیا گیا ہے، مصنفوں اور شاعروں کے حالات کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔ صرف حوالوں اور ماخذوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے تاکہ تحقیق کرنے والے اصحاب کتابوں تک پہنچ جائیں" (۱۱)۔ دیگر فہارس مخطوطات کی طرح اس تذکرۂ مخطوطات میں بھی ڈاکٹر زور نے پانچوں جلدوں کی قلمی کتابوں کی اجمالی فہرست کے پہلو بہ پہلو معطین مخطوطات کے اسمائے گرامی، پیش نظر تذکرۂ مخطوطات کی موضوع کے اعتبار سے مرتب کی ہوئی فہرست اور کتابوں، شخصیتوں اور مقامات کا بہ لحاظ حروف تہجی اشاریہ بھی شامل کیا ہے۔ اس جلد کو مرتب کرنے کے بعد ڈاکٹر زور نے یہ اطلاع دی تھی کہ "اس میں ۲۵۰ مخطوطات سے بحث کی گئی ہے اور اس کی اشاعت کے بعد ادارے کے جملہ ۱۱۵۰ مخطوطات کے بارے میں تفصیلات (۵ جلدوں میں) منظر عام پر آرہی ہیں۔ ابھی تقریباً چار ہزار مخطوطات ایسے ہیں جن کی ایسی ہی توضیحی فہرست مرتب اور شائع کرنی ہے اور اس تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے" (۱۲)۔

مخطوطات کی توضیحی فہرستیں معلومات کا خزانہ ہوتی ہیں بقول جمیل الدین عالی مخطوطات اپنی جگہ ایک تاریخ اور تماشہ ہوتے ہیں جن میں مختلف ادوار کے سوچنے اور لکھنے والوں کے ذہنی سفر اور زبان کے بدلتے ہوئے مناظر دکھائی دیتے ہیں" (۱۳)۔

ڈاکٹر زور سے پہلے بعض مستشرقین نے اور بعد کو پروفیسر سروری، حکیم شمس اللہ قادری نصیرالدین ہاشمی اور دیگر اہل علم نے بھی اردو مخطوطات کی فہارس مرتب و شائع کی تھیں، لیکن ان فہرستوں میں سے بعض میں مخطوطے کے مندرجات اور اس کی ظاہری ہیئت پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے اور متعدد توضیح طلب امور تشنہ رہ گئے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرۂ مخطوطات میں مخطوطے کی ظاہری حالت جیسے تقطیع، اوراق، نہج خط، مسطر، سنہ تصنیف، سنہ کتابت، کاتب کا نام، کاغذ، روشنائی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر متن میں ایک سے زیادہ رنگوں کی روشنائیاں ہوں تو ان کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اگر کسی مخطوطے کی مرمت اور درستگی کے دوران قلمی نسخے کے چاروں طرف کاغذ کی باریک پٹی چسپاں کی گئی ہو تو اس عمل کی "حوضہ بندی" کی اصطلاح کے ذریعے صراحت کی ہے۔ اگر کوئی ورق درمیان سے یا کنارے سے ٹوٹ رہا ہو یا خستہ ہو کر ضائع ہونے کے قریب ہو اور ایسے مقامات کو محفوظ کرنے کے لیے کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا متعلقہ مقام پر چسپاں کر دیا جائے تو "چٹ بندی" کے اس عمل کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ مخطوطے کی جلد، جزبندی، کرم خوردگی، آب رسیدگی اور کہنگی وغیرہ کی تصریح بھی کی ہے۔ اگر کسی وجہ سے متن متاثر ہوا ہے۔ یا متعدد آفات برداشت کرنے کے باوجود متن محفوظ ہے تو اس کی بھی وضاحت کی ہے۔ ایسے مقامات جو کرم خوردگی، آب رسیدگی یا کسی اور وجہ سے ناقابل قرأت ہو گئے ہوں تو نقطے لگائے ہیں۔ مخطوطے کے درمیان کہیں اگر خطاطی کے نادر نمونے یا تصویریں، اشکال یا نقشے ہوں تو ان کی تعداد اور خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں۔

مخطوطے کے موضوع اور متن کی صراحت کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے "آغاز" اور "اختتام" کی سرخی کے تحت چند ابتدائی اور اختتامی سطریں من و عن درج کر دی ہیں تاکہ اس کا مختصر نمونہ سامنے آجائے۔ اگر کسی مخطوطے کی درمیانی عبارت سے کسی تاریخی واقعے پر روشنی پڑتی ہو، یا کسی تاریخی حقیقت کی نفی ہوتی ہو تو متن کے اس حصے کا حسب ضرورت اقتباس بھی درج کیا ہے۔ قلمی نسخوں کے "ابتدائیوں" "سرخیوں" اور "ترقیموں" سے ڈاکٹر زور نے بھرپور استفادہ کیا ہے اور کاتب کی ابتدائی، "درمیانی" یا اختتامی عبارت کو جوں کا توں نقل کیا ہے۔

اگر مخطوطے کے کسی مقام پر مصنف نے اپنے بارے میں یا کاتب نے مصنف کے بارے میں کوئی اشارہ کیا ہو یا کسی اور کے بابت معلومات بہم پہنچائی ہوں تو ایسے مقامات کی خصوصی طور پر وضاحت کی ہے۔ یہ کام نہ صرف تحقیقی دروں بینی اور وسعت مطالعہ کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا بلکہ کافی محنت طلب بھی تھا اور صبر آزما بھی۔ ڈاکٹر زور کی ژرف نگاہی اور دروں بینی کی وجہ سے ان کا شمار اردو کے صفِ اول کے مخطوطہ شناسوں میں کیا جائے گا۔

حواشی و حوالے:

(۱) "یادگار زور" ص ۱۷۲۔

(۲) "تذکرۂ اردو مخطوطات" (جلد اول) ص ۱۳۔

(۳) حالیہ عرصے میں چند ایسے مخطوطات کا بھی پتہ چلا ہے، جن کے دیگر نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں (دیکھیے تذکرۂ مخطوطات۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو (جلد ۱) ترمیم و اضافہ محمد علی اثر)

(۴) "تذکرۂ مخطوطات" (جلد اول) ص ۱۴۔

(۵) ایضاً ص ۱۴۔

(۶) تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد دوم)۔ ترقی اردو بیورو ایڈیشن۔ ص ۲۵۔

(۷) "تذکرۂ اردو مخطوطات" (جلد سوم) ص ۷۔

(۸) تذکرۂ نوادر ایوانِ اردو"۔ ص ۱۷

(۹) ایضاً

(۱۰) ایضاً

(۱۱) "تذکرۂ اردو مخطوطات"۔ (جلد پنجم) ص ۵۔

(۱۲) "تذکرۂ اردو مخطوطات"۔ (جلد پنجم) ص ۵۔

(۱۳) "مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو"۔ کراچی۔ (جلد پنجم) ص ۲۔

(ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام ۲۹/ ستمبر ۹۶ء کو منعقد ہونے والے "یوم زور" سمینار میں پڑھا گیا)۔

مطبوعہ "سب رس" حیدرآباد۔ نومبر ۱۹۹۵ء۔

صفی اورنگ آبادی
بحیثیت استاد سخن

صفی اورنگ آبادی (۱۸۹۲ء - ۱۹۵۴ء) نہ صرف ایک خوش گو اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے بلکہ ایک کامل الفن استاد سخن کی حیثیت سے بھی ایک نمایاں مقام کے حامل تھے۔ ان کے زمانۂ حیات میں، ان کی شاعری کے خوب چرچے ہوئے لیکن کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہو سکا۔ ان کی وفات کے دو سال بعد ۱۹۵۶ء میں ماہنامہ "سب رس" (ادارۂ ادبیات اردو - حیدرآباد) کا ایک خصوصی شمارہ "یادگارِ صفی" (مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد) کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں صفی کے بعض شاگردوں اور نقادوں کے مضامین کے علاوہ، ان کا نمونۂ کلام بھی شامل تھا۔ صفی کے منتخب کلام کی پہلی اشاعت ۱۹۶۳ء میں "انتخابِ کلامِ صفی" (مرتبہ مبارز الدین رفعت) کے نام سے عمل میں آئی۔ ۱۹۶۵ء میں صفی کے ایک شاگردِ رشید خواجہ شوق نے "پراگندہ" کے عنوان سے ان کا ایک اور مجموعۂ کلام شائع کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ "پراگندہ" ہی کے ذریعے صفی کی شاعری کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ ۱۹۶۸ء میں سید غوث یقین کی کتاب "فردوسِ صفی" پاکستان سے شائع ہوئی۔ ۱۹۸۷ء میں رؤف رحیم کی کتاب "گلزارِ صفی" اور ۱۹۸۹ء میں مولوی محمد نور الدین خاں کی مرتبہ کتاب "سوانح عمری صفی اورنگ آبادی" منظرِ عام پر آئی۔ ۱۹۹۱ء میں محبوب علی خاں اخگر قادری نے "تلامذہ صفی اورنگ آبادی" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی۔ ۱۹۹۳ء میں محمد نور الدین خاں کی مرتبہ صفی کے غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل ایک اور کتاب "کلام صفی اورنگ آبادی" کے عنوان سے منظرِ عام پر آئی۔ صفی شناسی کے سلسلہ میں محمد نور الدین خاں کے علاوہ محبوب علی خاں اخگر قادری نے بھی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ مؤخر الذکر ادیب نے مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۶ء کے

درمیانی عرصے میں "اصلاحات صفی" "خمریات صفی" اور "انشائے صفی" کے نام سے مزید تین کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔

صفی ایک پر گو شاعر ہونے کے علاوہ، شاعری کے فنی رموز سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ اپنی شاعری میں فنی آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھنے کے علاوہ وہ اس بات کے بھی آرزومند تھے کہ دوسرے شعرا، خصوصاً ان کے تلامذہ بھی فنی تقاضوں کا پوری طرح پاس ولحاظ رکھیں۔ اپنی زندگی میں جہاں بھی کوئی جوہر قابل نظر آیا انھوں نے اسے اپنی شاگردی میں قبولیت کا اعزاز بخشنے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ اس طرح سینکڑوں شعراء دکن، ان کے دامن تلمذ سے وابستہ ہوگئے۔ ان میں سے کچھ تو اولین دور کے شاگرد ہیں، کچھ دور وسطیٰ کے اور اکثر و بیش تر تلامذہ ایسے ہیں جنھوں نے ان کی زندگی کے آخری دور میں ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ اگر تینوں ادوار کے شاگردوں کی فہرست تیار کی جائے تو ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے، لیکن ان تلامذہ میں چند ہی ایسے ہیں، جن کا کلام شعری مجموعوں کی صورت میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ کافی تعداد ان شاگردوں کی ہے، جن کا کلام یا تو صرف اخباروں اور جریدوں کی زینت بنا رہا یا پھر منظر عام پر ہی نہیں آسکا۔ اس طرح صفی کے متعدد شاگردوں کا کلام اور ان کے حالات زندگی مرور ایام کے طفیل ہنوز پردہ خفا میں ہیں۔

جہاں تک صفی کی شاعری کا تعلق ہے۔ غزل ان کی محبوب صنف سخن تھی، اسی صنف میں انھوں نے اپنی جدت طبع، زور کلام، لطف ادا، حسن بیان اور شیرینی زبان کے جوہر دکھائے۔ صفی اورنگ آبادی تغزل کا ایک رچا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں سادگی و سلاست کا حسن پایا جاتا ہے۔ واقعیت اور اصلیت کے علاوہ صوفیانہ افکار کی حرارت بھی ہے اور معاملات حسن و عشق کی نیرنگیاں بھی۔ لیکن ان کی اہمیت اور عظمت محض اس لیے نہیں ہے کہ انھوں نے اردو غزل کو آب و تاب اور توانائی بخشی بلکہ اس لیے بھی ہے کہ انھوں نے استاد سخن کی حیثیت سے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے فیض تربیت سے بہرہ ور یاب کیا ہے۔

اردو شاعری میں استادی اور شاگردی کی روایت نہایت قدیم ہے۔ اردو

ادب کے تینوں اہم دبستانوں (دبستانِ دکن، دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو) میں اس روایت کا تسلسل اور ارتقاء ملتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ استادی اور شاگردی کی روایت نے بتدی شاعروں کی تربیت اور پرداخت کے علاوہ صحت مند شعری رجحانات کو فروغ دینے میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے۔

میدان شاعری کے ہر نو وارد کو اپنے کلام کے حسن و قبح کی پرکھ اور پہچان کے سلسلے میں، ایک استادِ سخن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ کسی ایسے شاعر کو اپنا رہنما یا استاد بناتا ہے جو زبان و بیان اور الفاظ و محاورات کے صحیح استعمال کے علاوہ دیگر عروضی و معنوی نکات سے بھی کماحقہ وقفیت رکھتا ہو۔ استاد کے آگے ایک مدت تک زانوئے ادب تہہ کرنے کے بعد جب شاگرد کے کلام میں اصلاح کی گنجائش باقی نہیں رہتی تو اسے فارغ التحصیل قرار دے دیا جاتا ہے۔

استادی کے منصب پر فائز ہونے والے شاعر کی بڑی ذمے داریاں ہوتی ہیں۔ اسے نہ صرف اپنی اصلاح و ترمیم سے شاگرد کو مطمئن کرنا پڑتا ہے بلکہ اس کے اصلاح شدہ کلام پر کوئی اعتراض ہو جائے تو اس کا معقول جواب بھی دینا پڑتا ہے۔ شاعری کے میدان میں تلامذہ کی کامیابی سے استاد کی شہرت اور ناموری میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے استاد، اصلاحِ سخن کا کام پورے انہماک اور ذمے داری سے انجام دیتا ہے۔ تاریخ ادب میں متعدد شاعروں کے نام اس لیے زندہ رہیں گے کہ وہ کسی نامور استاد کے شاگرد تھے یا کسی اچھے شاگرد کے استاد۔

صفی اورنگ آبادی نے ایک طرف ضیا گورگانی، ظہور دہلوی، فروغ حیدرآبادی اور رضی الدین حسن کیفی جیسے اساتذہ سخن سے فیضِ تربیت اٹھایا تو دوسری طرف ان کے تلامذہ میں غلام علی حادی، میر بہادر علی جوہر، سید علی سریر، صابر علی شاکر، حکیم غفار احمد ماجد، سرفراز علی ناوک، شمس الدین تاباں، روحی قادری، جہاں دار افسر، خواجہ شوق، نظیر علی عدیل، امان ارشد، غیاث صدیقی جیسے متعدد باکمال شعرا شامل ہیں۔

صفی ایک بلند مرتبہ شاعر ہونے کے علاوہ باکمال سخن سنج اور سخن شناس بھی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد بھی شاعری کے فنی تقاضوں کا پوری طرح پاس

ولحاظ رکھیں۔ صفی کی تنقیدی بصیرت اور شاعری کے فن سے ان کی گہری وابستگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مطالعہ کتب کے دوران اگر انھیں کسی شعر میں کوئی سقم نظر آتا تو اپنے قلم سے اس کی تصحیح بھی کر دیا کرتے تھے۔ محمد عبدالعزیز نے اپنے ایم۔اے (عثمانیہ) کے مقالے "صفی اورنگ آبادی۔ شخصیت اور شاعری" میں اس سلسلہ کے چند اشعار پیش کیے ہیں۔ یہاں صرف تین شعر نموناً پیش کیے جاتے ہیں:

صفی	حسرت
"یہ سب فریب ہیں" آغازِ عشق کے حسرت	فریب سب ہیں یہ آغازِ عشق کے حسرت
وہ لیں گے اس کرم بے حساب کے بدلے	وہ لیں گے اس کرم بے حساب کے بدلے
صفی	**فانی**
"کہتے ہیں" کہ ہم وعدۂ پرسش نہیں کرتے	کہتے ہو کہ ہم وعدۂ پرسش نہیں کرتے
یہ سن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا	یہ سن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا
صفی	**شاد عظیم آبادی**
وہی ناشاد کن آہیں وہی ناکام گر نالے	وہی رہ رہ کے گھبرانا وہی ناکام گر آہیں
بجز اس بات کے تجھ سے دل ناکام کیا ہوگا	بجز اس بات کے تجھ سے دل ناکام کیا ہوگا

صفی اورنگ آبادی مشاعروں میں جہاں اچھے شعر کی دل کھول کر داد دیتے تھے وہیں کسی کے کلام میں اگر کوئی سقم نظر آئے تو خاموش بھی نہیں رہتے تھے۔

مولوی عظیم الدین محبت نے "مملکت آصفیہ" میں ایک مشاعرے کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ایک مشاعرے میں انھوں (جلیل مانک پوری) نے غزل پڑھی تھی جس کا مطلع تھا:

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی　　کی ہے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

جلیل کے شاگردوں نے تعریفوں کے ڈونگر برسائے سامعین نے بھی واہ واہ کی۔ حضرت بہبود علی صفی بھی موجود تھے انھوں نے نے قدرے تبدیلی کے ساتھ شعر دہرایا

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی   کی ہے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

"کرکے توبہ" کی بجائے "کی ہے توبہ" کی اصلاح پر صفی کے شاگردوں نے جو تعریف کی تو آسمان سر پر اٹھالیا۔ مشاعرے کے دوسرے دن شہر کے گلی کوچوں میں یہ بات پھیل گئی۔ اعلیٰ حضرت کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے فرمان نکالا کہ جلیل صاحب استاد شاہ ہیں انھیں مشاعروں میں شرکت نہیں کرنی چاہیے۔ آخر دم تک جلیل کو کسی نے مشاعروں میں نہیں دیکھا" (۱)۔

صفی کی اصلاح کا طریقہ یہ تھا کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ وہ بیجا تصرف و ترمیم کے قائل نہیں تھے۔ جہاں بھی اصلاح کی گنجائش ہوتی، مناسب ترمیم و تنسیخ ضرور کرتے تھے۔ ذیل میں چند اصلاحیں درج کی جاتی ہیں، جن کے مطالعہ سے صفی کے کمالِ فن اور شعری دروں بینی پر روشنی پڑتی ہے:

غلام محبوب خاں کا مسلم کا شعر تھا   تجھے دنیا کہے گی کیسے مسلم
جو دل کو اپنے بت خانہ بنادے

اصلاح   تجھے مسلم کہے گا کون مسلم
جو اپنے دل کو بت خانہ بنادے

صفی نے جہاں پہلے مصرع میں مسلم کی تکرار سے صوری اور معنوی حسن میں اضافہ کیا ہے تو وہیں دوسرے مصرع کو صرف الفاظ کے تغیر و تبدل سے چست اور رواں بنادیا۔

سید علی سریر کے درج ذیل شعر پر صفی کی اصلاح ملاحظہ کیجئے:

اصل شعر   گل ہائے داغِ عشق کی اس میں کمی نہیں
سینے کو میرے دیکھ کہ گلزار ہوگیا

اصلاح   گل ہائے داغِ عشق کی اس میں کمی نہیں
سینے کو میرے دیکھئے گلزار ہوگیا

اس شعر کے مصرع ثانی میں صفی نے "دیکھ کہ" کو "دیکھئے" سے بدل دیا ہے، جس کی

وجہ سے نہ صرف مصرع مترنم ہوگیا بلکہ "ک" کی تکرار سے تنافر صوتی کا نقص بھی دور ہوگیا:

جاوید قادری کا شعر تھا — ہوگیا اپنا جگر ہی چاک چاک
یہ ہماری آہ کی تاثیر ہے

اصلاح — اور برہم ہوچکے وہ دیکھئے
یہ ہماری آہ کی تاثیر ہے

اس شعر کے مصرع اولیٰ کی تبدیلی کی وجہ سے شعر پر لطف ہوگیا ہے۔

صفی اورنگ آبادی کی اصلاحیں بالعموم ان کے تلامذہ کی صحیح رہنمائی کا باعث ہوتی تھیں، ان کی اصلاح کا ایک اصول یہ تھا کہ اکثر مقامات پر اصلاح و ترمیم کے بعد اس کے وجوہ و علل بھی تحریر کر دیا کرتے تھے۔ تاکہ شاگردوں کو اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کی نوعیت معلوم ہوجائے اور وہ آئندہ اس قسم کی فروگذاشتوں کے مرتکب نہ ہوں۔

صفی اپنے شاگردوں کو روزمرہ، محاوروں اور ضرب الامثال کو کثرت سے استعمال کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ نظیر علی عدیل کے ایک شعر پر صفی کی اصلاح اور توجیہ دیکھیے:

اصل شعر — وعدہ تو ہے کہ خواب میں آئیں گے وہ عدیل
مجھ کو خوشی میں نیند نہ آئے تو کیا کروں

اصلاح — وعدہ تو ہے کہ خواب میں آئیں گے وہ عدیل
مارے خوشی کے نیند نہ آئے تو کیا کروں

توجیہہ: "خوشی کے مارے" محاورہ ہے اور جہاں شعر میں محاورہ کی گنجائش ہو تو ضرور استفادہ کیجیے۔"

صفی کے استادانہ فن اور شاعرانہ کمال کے جوہر ان اصلاحوں میں زیادہ کھلتے ہیں جہاں انھوں نے لفظوں کی نشست میں ہلکا سا الٹ پھیر کرکے، یا دو ایک الفاظ کو بدل کر کبھی سپاٹ اور بے لطف مصرعوں کو چست اور رواں بنادیا ہے تو کبھی

معنوی اعتبار سے شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

وقار الدین وقار کا شعر تھا:

شش جہت سے تری آواز مجھے آتی ہے
کتنی راہوں سے بہ یک وقت گزرنا ہے مجھے

صفی کی اصلاح دیکھیے:

شش جہت سے تری آواز چلی آتی ہے
کتنی راہوں سے بہ یک وقت گزرنا ہے مجھے

نظیر علی عدیل کا شعر تھا:

آدمی جب غم شناسا ہو گیا
مقصد تخلیق پورا ہو گیا

صفی کی اصلاح ہے:

آدمی جب خود شناسا ہو گیا
مقصد تخلیق پورا ہو گیا

بہادر علی جوہر کا شعر دیکھیے:

قفس میں دخل جو صیاد کا نہیں ہوتا
یہاں بھی ڈالتے ہم طرح آشیاں کے لیے

صفی کی اصلاح ملاحظہ ہو:

قفس میں خوف جو صیاد کا نہیں ہوتا
یہاں بھی ڈالتے ہم طرح آشیاں کے لیے

امان ارشد کا درج ذیل شعر اصلاح سے پہلے یوں تھا:

کس منزل میں ذوق سفر ہے
ہر منزل پر راہ گزر ہے

صفی کی اصلاح کے بعد ملاحظہ ہو:

کس منزل میں ذوق سفر ہے
ہر منزل اک راہ گزر ہے

حوالے و حواشی:

(۱) عظیم الدین محبت - مملکت آصفیہ (ج ۱) - کراچی - ۱۹۸۴ء - ص ۴۹۴ - یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے اپنے مضمون "دکن میں ذوق سخن" میں اس روایت کو مدلل طور پر غلط ٹھہرایا ہے - روزنامہ "سیاست" ۱۸/نومبر ۱۹۹۶ء ص ۳-



"فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ" پر ایک نظر

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام کے ساتھ ہی ذہن میں ایک قدآور ادبی شخصیت اور اس کے متنوع تحقیقی، تنقیدی، ثقافتی، علمی اور ادبی کارناموں کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو ادب کے لیے جو تن تنہا کام کیا ہے، وہ کئی اداروں کی جانب سے کیے جانے والے کام پر بھاری ہے۔ ایک طرف تو ان کا چار ضخیم جلدوں پر مشتمل، بسوط، مستند اور معرکہ آرا کارنامہ "تاریخ ادب اردو" ہے (۱)۔ تو دوسری جانب مغربی تنقید کے افکار کے تراجم پر مبنی ان کی فقید المثال کتابیں "ایلیٹ کے مضامین" اور "ارسطو سے ایلیٹ تک" ہیں۔ جو کسی بھی طرح "تاریخ ادب اردو" سے کم تر اہمیت کی حامل نہیں۔ ان کا ایک اور غیر معمولی کارنامہ جو ان کی دس سالہ محنت شاقہ کا حاصل ہے وہ ان کی "انگریزی اردو لغت" ہے۔ اس لغت میں ڈھائی سو سے زیادہ علوم و فنون کے الفاظ و اصطلاحات شامل ہیں۔ یہ کتاب ایک عام ڈکشنری کی حیثیت رکھتی ہے جو دو لاکھ الفاظ و اندراجات پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ تحقیق و تنقید، دکنیات، تدوین متن اور ثقافتی مسائل جیسے مختلف النوع اور ہمہ جہت موضوعات کے تعلق سے، ان کے علمی اور ادبی کارناموں کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

احمد ندیم قاسمی نے ڈاکٹر جمیل جالبی کو عہدِ حاضر کے بلند قامت محقق اور نقاد قرار دیتے ہوئے نہایت جامع انداز میں لکھا ہے:

"جمیل جالبی موجودہ عہد کے معتبر ترین محققین اور ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ ادبی تحقیق کے علاوہ تنقید، ادبی تاریخ نگاری، لغت نویسی اور تراجم کے شعبوں میں انھوں نے ہمیشہ باقی رہنے والے کارنامے انجام دیے ہیں۔ وہ متعدد ادبی، ثقافتی، تہذیبی اور تعلیمی اداروں سے متعلق رہ چکے ہیں اور اب بھی کئی اہم اداروں کے

رکن ہیں۔ان اداروں کی کارکردگی میں بھی انھوں نے اپنے تبحر علمی
کی بناپر یادگار اضافے کیے ہیں۔غرض وہ ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت
ہیں کہ علم وادب اور شعروفن کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جو ان کی
مثبت توجہ سے محروم رہا ہو" (۲)۔

ڈاکٹر جالبی کی اولوالعزمی اور نئے علمی گوشوں کی تلاش نے، حال ہی میں انھیں فنی اور علمی اصطلاحات کے میدان کی طرف متوجہ کیا ہے۔اسی جستجو اور تلاش کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں وضع کی گئی اصطلاحات کو نہ صرف دست برد زمانہ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی بلکہ انھیں ریزہ ریزہ جمع کر کے، جدید سائنسی انداز سے مرتب اور شائع بھی کر دیا ہے۔

اردو میں اصطلاحات سازی کے کام کا آغاز، انیسویں صدی کے ربع دوم میں، دلی کالج کے قیام کے ساتھ ہی ہوا۔اور پھر مختلف اداروں اور افراد نے حسب مقدور اس سلسلہ کو آگے بڑھایا لیکن اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں یہ کام باضابطہ اور باقاعدگی کے ساتھ اس وقت کے مستند عالموں نے انجام دیا ہے۔مختلف علوم کی جو اصطلاحیں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے مترجمین نے وضع کیں وہ ان علوم وفنون کے مختلف تراجم میں من وعن مستعمل اور مقبول ہوئیں اور مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے آخر میں انگریزی اصطلاحات اردو مترادفات کے ساتھ بطور فرہنگ شامل رہیں۔سیاسی حالات کی بنا پر وہ کتابیں غیر مستعمل ہو گئیں اور کتابوں کا جو ذخیرہ دارالترجمہ میں موجود تھا وہ بھی ضائع ہو گیا۔

ملک کی آزادی کے بعد اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی گئی کہ طلبہ کو علوم وفنون کی تعلیم، ان کی مادری زبان کے ذریعے حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔جہاں دوسری علاقائی زبانوں میں اصطلاحات کے ترجمے کے کام کا از سر نو آغاز ہوا وہیں اردو میں بھی اصطلاحات سازی کی طرف توجہ دی گئی۔ہندستان میں ترقی اردو بیورو نے اس مقصد کے تحت علوم وفنون کی مختلف کمیٹیاں تشکیل دیں اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین نے اصطلاحات سازی کا کام انجام دیا۔پاکستان میں بھی، مختلف علمی اداروں، جامعات، نجی ناشرین اور خصوصیت کے ساتھ "مقتدرہ

قومی زبان " نے مناسب اردو اصطلاحات کو رواج دینے کی کوشش کی۔ ایک ہی نوعیت کے کام کے مختلف ملکوں اور اداروں میں انجام پانے کا نتیجہ ایک انتشار کی صورت میں رونما ہوا۔ یعنی ایک ہی انگریزی اصطلاح کے لیے ایک سے زاید اردو مترادفات پیش کیے گئے اور اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک اصطلاح کے لیے ایک ہی مترادف مخصوص کر دیا جائے تاکہ طلبہ کو کسی الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کام کے لیے ضروری تھا کہ اب تک ہماری زبان میں، اصطلاحات کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ پیشِ نظر رہے۔ اس تناظر میں ڈاکٹر جالبی کی دو ضخیم جلدوں میں مرتبہ (پہلی جلد ۱۹۹۱ء، دوسری جلد ۱۹۹۳ء) " فرہنگ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ " کئی وجوہ کی بنا پر غیر معمولی اہمیت اور افادیت کی حامل نظر آتی ہے۔ ایک تو یہ کہ جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحات، اپنے وقت کے ماہرِ علوم اساتذہ کے غور و فکر کا نتیجہ ہیں اور دوسرے یہ کہ دارالترجمہ کے اراکین نے اصطلاحات سازی کے لیے پہلے ہی کچھ آئین و اصول مقرر کر لیے تھے اور انھیں کے مطابق اس کام کو سرانجام دیا گیا۔ چوں کہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا یہ کام ایک منصوبہ بند اور منظم طریقے سے اور بہت بڑے پیمانے پر ہوا تھا، اس لیے اس کا پیشِ نظر رکھنا از حد ضروری ہے۔ بقول ڈاکٹر مجیب الاسلام " دارالترجمہ کی مجلس وضعِ اصطلاحات " کے کل ۱۳۳۰۱ اجلاس ہوئے اور ۸۶۵۶۳/ اصطلاحات وضع کی گئیں " (۳)۔ یہ درست ہے کہ متعلقہ علوم اس عہد کے بعد ارتقائی منازل طے کر کے بہت زیادہ وسیع ہو گئے ہیں لیکن جو بنیادی اور مستقل اصطلاحیں ہیں وہ آج بھی من و عن قائم اور مروج ہیں۔

کسی بھی اصطلاح کا نیا مترادف وضع کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے وضع کیے گئے مترادفات کو ہر پہلو سے جانچ لیا جائے۔ یہ کام اس لحاظ سے مشکل تھا کہ مختلف علوم و فنون کی اصطلاحیں، مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں اور یہ تمام کتابیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ڈاکٹر جالبی کی مرتبہ " فرہنگ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ " کے منظرِ عام پر آنے کے بعد، اس قبیل کا کام کرنے والے ماہرین، کمیٹیوں اور اداروں کے لیے قطعی دشوار نہیں کہ وہ پورے طور سے جانچ اور پرکھ سکیں۔ اگر نئی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت بھی

پیش آئے تو قدیم اصطلاحات سے واقفیت یقیناً بہتر رہنمائی کا کام انجام دے گی۔

جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحات، اردو زبان کے ارتقا میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان اصطلاحات کو جمع اور مرتب کرنے کے کام کو کسی اہلِ دکن اور عثمانین کو بہت پہلے ہی انجام دینا تھا، کیوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کام کی تکمیل دشوار ترین ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر جالبی قابلِ مبارک باد ہیں انھوں نے حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ سے ہزاروں میل کے فاصلے پر رہ کر بھی نہ صرف اس کام کا بیڑہ اٹھایا، بلکہ بحسن خوبی پایہ تکمیل کو بھی پہنچایا۔

"فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ" کی پہلی جلد میں بتیس علوم و فنون اور ان کی ذیلی شاخوں سے متعلق، انگریزی اصطلاحات اور ان کے اردو مترادفات حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ہر اصطلاح کے ساتھ انگریزی میں اس علم یا فن کے مختلف مخففات قوسین میں درج کیے گئے ہیں، جن سے کہ وہ متعلق ہیں۔مقدمہ میں جالبی صاحب نے تاریخ اصطلاحات سازی کے ساتھ ساتھ ان اصولوں کو بھی بیان کر دیا ہے، جن کی بنیاد پر یہ اصطلاحات وضع کی گئی تھیں۔آخر میں ایک سو چوبیس کتابوں پر مشتمل "فرہنگ ماخذ" بھی دی گئی ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کو مرتب کرنے کے دوران کون کون سی اور کتنی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

"فرہنگِ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ" کی دوسری جلد میں اٹھائیس علوم و فنون سے متعلق انگریزی اصطلاحات اور ان کے اردو متبادل الفاظ شامل ہیں اور فہرستِ ماخذ میں سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ۳۳ مطبوعات کا تذکرہ ہے۔جس میں جلد اول کی طرح ڈیوی کے اصولِ درجہ بندی کو اپنایا گیا ہے۔

مطبوعہ "ہماری زبان" دہلی۔۱۵/ اکتوبر ۱۹۹۱۔ص ۴۔

حواشی:

(۱) تاریخ ادب اردو کی تاحال صرف دو جلدیں منظر عام پر آئی ہیں۔

(۲) ادبی تحقیق۔(ڈاکٹر جمیل جالبی) مجلس ترقی ادب۔لاہور۔ص ۷۔

(۳) دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی علمی اور ادبی خدمات اور اردو زبان و ادب پر اس کے اثرات۔ص ۱۹۸۔

جنوبی ہند کا ایک کثیر التصانیف شاعر

جنوبی ہند کی سرزمین کو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ اردو میں تصنیف و تالیف کی روایت کا آغاز یہیں ہوا۔ اردو نظم و نثر کی کم و بیش تمام اصناف کے ابتدائی نمونے بھی یہیں ملتے ہیں اور اردو کے اولین قد آور سخن ور اور نثر نگار بھی اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ پندرھویں صدی کے آغاز سے سترھویں صدی عیسوی کے اختتام تک بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار میں، گلبرگہ، بیدر، بیجاپور اور گولکنڈہ میں جو ادب تخلیق ہوا وہ اپنے صحت مند ادبی رجحانات حقیقت پسندی، واقعہ نگاری اور اپنے ماحول کی عکاسی کی وجہ سے شمالی ہند میں نشو و نما پانے والی شعری اور نثری نگارشات کے مقابلے میں بھی فوقیت رکھتا ہے۔

عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے زوال کے بعد یہاں کی علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیاں اورنگ آباد اور حیدر آباد کے علاوہ جنوب بعید کے دور افتادہ علاقے تامل ناڈو منتقل ہو گئیں، جہاں صوبہ آرکاٹ اور ویلور، شعرا اور ادیبوں کے لیے دارالنور اور دارالسرور کی حیثیت رکھتے تھے۔ تمل ناڈو کے یہ دونوں مراکز عہد قدیم ہی سے اردو شعر و ادب کی قدر افزائی اور سرپرستی کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ یہاں کے شعری اور نثری کارناموں میں دبستان گولکنڈہ اور بیجاپور کی ادبی اور تہذیبی روایات اور رجحانات کا تسلسل نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ تمل ناڈو سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کا سلسلہ شاہ سلطان ثانی (متوفی ۱۶۸۵ء) شاہ عالم شغلی (متوفی ۱۷۰۲ء) شاہ عبد القادر میراں شاہ ولی اللہ، حافظ سید محمد فراقی (متوفی ۱۷۳۱ء)، شیخ محمد مخدوم عبد الحق ساوی (متوفی ۱۷۵۱ء)، سید شاہ ابو الحسن قربی (متوفی ۱۷۶۸ء)، اسمٰعیل خاں ابجدی (۱۷۸۸ء)، شاہ عثمان سرور (متوفی ۱۷۷۶ء)، شاہ تراب چشتی (پیدائش ۱۷۱۷ء)، علیم اللہ شاہ قادری (متوفی ۱۷۹۲ء) باقر آگاہ ویلوری (متوفی ۱۸۰۵ء)

اور سید محمد غوث غوثی (متوفی ۱۸۱۰ء) سے ہوتا ہوا سید علیم الدین (علیم صبا نویدی) تک پہنچتا ہے۔

علیم صبا نویدی عہدِ حاضر کے ایک زود نویس اور کثیر التصانیف سخن ور اور نثار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ان کی زود گوئی کا یہ عالم ہے کہ ایک ہی نشست میں متعدد تخلیقات سپرد قرطاس کر دیتے ہیں۔ابتداً انھوں نے اپنے فن کا کمال افسانہ نگاری اور شاعری کے میدان میں دکھایا تھا اور تقریباً دو دہوں کے درمیان افسانوں کے دو (۱) اور شاعری کے پندرہ مجموعے اردو ادب کو دیے۔یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ صبا نے خداداد تخلیقی صلاحیتوں اور تنقیدی شعور کے باوصف اپنے آپ کو محض شاعری اور افسانہ نگاری کے دائرے میں محدود نہیں رکھا بلکہ تحقیق و تنقید کی دشوار گذار وادیوں کی سیاحی کا بھی بیڑہ اٹھایا اور تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی پانچ تصانیف شائع کیں۔اس کے پہلو بہ پہلو انھوں نے چار مزید کتابیں مرتب کیں جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

(الف)۔افسانوں کے مجموعے:

(الف)۔افسانوں کے مجموعے:	۱) شگاف در شگاف	(۱۹۸۰ء)
	۲) اجلی مسکراہٹ	(۱۹۹۲ء)
(ب)۔شعری مجموعے:	۱) طرحِ نو	(۱۹۷۴ء)
	۲) لمسِ اول	(۱۹۷۸ء)
	۳) ردِ کفر	(۱۹۷۹ء)
	۴) فکر بر	(۱۹۸۱ء)
	۵) نقش گیر	(۱۹۸۴ء)
	۶) بھارت جیوتی	(۱۹۸۵ء)
	۷) ترسیلے	(۱۹۸۶ء)
	۸) شارعِ شرق	(۱۹۸۷ء)
	۹) مراۃ النور	(۱۹۸۸ء)
	۱۰) تشدید	(۱۹۸۹ء)
	۱۱) نور السموات	(۱۹۹۰ء)
	۱۲) ن	(۱۹۹۰ء)

۱۳) اثرِ خامہ (۱۹۹۱ء)

۱۴) سمت ساز (۱۹۹۲ء)

۱۵) خوشبو کے داغ (۱۹۹۳ء)

(ج) تحقیقی و تنقیدی تصانیف:

۱) جنوب کا شعروادب (۱۹۹۳ء)
(مرتبہ ڈاکٹر محمد علی اثر) دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء

۲) باقر آگاہ کے ادبی نوادر (۱۹۹۴ء)

۳) نواب والاجاہ اور بحرالعلوم (۱۹۹۵ء)

۴) تمل ناڈو کے صاحبِ تصنیف علما (۱۹۸۶ء)

۵) تمل ناڈو میں اردو
ترقی اردو بیورو ۔ دہلی (زیرِ طبع)

(د) مرتبہ کتابیں:

۱) قید شکن (۱۹۸۲ء)

۲) آزاد غزل شناخت کی حدوں میں (۱۹۸۳ء)

۳) ثبوت
(ساغر جیدی کے دوہوں کا مجوعہ) (۱۹۹۰ء)

۴) آبِ زر
(اکرام کاوش کی نظمیں) (۱۹۹۲ء)

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ علیم صبا کی شخصیت اور ان کے فکر وفن کے مختلف گوشوں پر اردو کے مشہور نقادوں نے جو کتابیں نے مرتب کی ہیں یہاں ان کا تذکرہ خالی از دل چسپی نہ ہوگا۔

۱) لہجہ تراش (۱۹۸۴ء) مرتبہ کاظم نائطی ۲) آسمانِ فن کا سفیر (۱۹۸۵ء) مرتبہ پروفیسر نجم الہدیٰ ۳) نقش بند (۱۹۸۸ء) مرتبہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ۴) روشن لکیر (۱۹۹۱ء) مرتبہ ڈاکٹر اختر بستوی ۵) نقشِ قلم (۱۹۹۲ء) مرتبہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ۶) خامہ در خامہ (۱۹۹۴ء) مرتبہ ڈاکٹر محمد علی اثر ۷) عکس در عکس (علیم صبا نویدی کا سوانحی خاکہ) (۱۹۹۵ء) مرتبہ محمد یعقوب اسلم ۸) بنامِ علیم صبا نویدی (۱۹۹۶ء) مشاہیرِ ادب کے خطوط ۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد علی اثر

علیم صبانویدی کی شاعری کا تمل زبان میں "پیسیم ویرلگل" (۱۹۹۲ء) کے نام سے اور تلگو میں "پری ملاویچی کلو" کے عنوان سے ترجمہ بھی ہوا ہے اول الذکر کتاب کے مترجم سجاد بخاری اور موخرالذکر کتاب کے مترجم ساغر جیدی ہیں۔

یہاں اس بات کا انکشاف بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علیم صبا کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بہار یونیورسٹی سے محمد قاسم کو اور (۲) سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد سے محمد جعفر کو (۳) علی الترتیب پی۔ایچ۔ڈی اور ایم۔فل کی سند مل چکی ہے۔اس کے علاوہ دیگر جامعات میں بھی ان کے فکر و فن کے موضوع پر تحقیقی کام ہورہا ہے۔علیم صبا افسانہ نویس بھی ہیں اور انشائیہ نگار بھی۔ محقق بھی ہیں اور نقاد بھی لیکن مجموعی طور پر ان کی شہرت اور نام وری کا دار و مدار صرف شاعری پر ہے اور ان کی گراں مایہ شاعری کے مقابلے میں نثری کارنامے کچھ دب سے گئے ہیں۔

جہاں تک علیم صبا کی شعر گوئی کا تعلق ہے، مذکورہ بالا پندرہ شعری مجموعوں میں سے چار مجموعے "طرحِ نو"۔"فکر بر"۔"نقش گیر" اور "اثر خامہ" جدید اردو غزل کی نمائندگی کرتے ہیں۔تین مجموعے "مراۃ النور"، "نور السموات" اور "ن" نعتیہ کلام کے مجموعے ہیں۔"لمسِ اول" اور "بھارت جوتی" ان کے دیگر مجموعہ ہائے کلام ہیں، جن میں اول الذکر ٹیپ بند نظموں پر مشتمل ہے اور آخرالذکر قومی منظومات کا مجموعہ ہے۔حال ہی میں ان کے دو اور شعری مجموعے ("سمت ساز" اور "خوشبو کے داغ") منظرِ عام پر آئے ہیں جو بالترتیب آزاد نظموں اور رومانی نظموں پر مشتمل ہیں۔

علیم صبا نویدی کی طبع رسا نے شاعری کے میدان میں جو جولانی دکھائی ہے اور نئے تجربے کئے ہیں وہ ایک علاحدہ باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔اردو میں آزاد غزل کے اولین نمونے مظہر امام اور مناظر عاشق ہرگانوی کے کلام میں نظر آتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں علیم صبا کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس صنفِ شاعری پر انھوں نے اس کے دورِ طفولیت ہی میں باقاعدہ توجہ کی اور نہ صرف یہ کہ آزاد غزلوں کا پہلا مجموعہ "ردِ کفر" کے نام سے مرتب کرکے شائع کیا بلکہ آزاد غزل کا پہلا انتخاب "قید شکن" بھی منظرِ عام پر لانے کا اعزاز حاصل کیا۔

علیم صبا ایک تخلیقی فن کار ہے۔اس نے جہاں جدید اصنافِ شعر "ہائکو"۔

"سانیٹ بلانک ورس" وغیرہ میں اپنی جدت طبع کے جوہر دکھائے وہیں سانیٹ کی ہیئت میں نعتیں کہہ کر "نور السموات" کے عنوان سے نعتیہ سانیٹ کا پہلا مجموعہ بھی شائع کیا۔ نعتیہ شاعری کے سلسلہ میں بقول "پروفیسر عتیق احمد صدیقی" ان کے لہجے کے جس نئے پن کا اردو دنیا میں اعتراف کیا جاتا ہے، اس کی آمیزش سے نعت کو بھی ایک نیا رنگ و آہنگ ملا ہے" (۴)۔ صنف نعت رسول میں علیم صبا نویدی کو تین مجموعے شائع کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔

علیم صبا جدید شعراء کی صف میں مشاعروں کے راستے سے نہیں بلکہ رسائل و جرائد اور کتابوں کے توسط سے داخل ہوئے۔ ان کی شہرت تیزی سے پھیلی اور اس کے پھیلنے میں، ان کے منفرد لب و لہجے اور مخصوص طرز احساس کو بڑا دخل ہے۔ ان کی شاعری وقتی طور پر محظوظ کرنے والی چیز نہیں بلکہ قارئین اور سامعین پر اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ صبا نویدی کی تخلیقات کا سرچشمہ، ان کے کتابی مطالعے سے زیادہ ان کا ذاتی مشاہدہ اور ان کی حساس طبیعت معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے اسالیب، علامات اور لفظیات پر بہ نظر غائر غور کیا ہے اور انھیں اپنے انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے۔

علیم صبا نویدی اگرچہ کہ ایک جدت پسند اور جدید لب و لہجے کے شاعر ہیں تاہم ان کے کلام کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ انھوں نے اردو شاعری کی روایت سے انحراف یا چشم پوشی بھی نہیں کی ہے۔ اردو غزل کی روایات اور اس کے نشیب و فراز سے وہ بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کا ذوق و ذہن ہمارے شعری ورثے اور تہذیبی روایت سے پوری طرح سیراب ہے۔ روایت کی پاسداری کے باوجود وہ روایتی شاعری کے غبار میں گم نہیں ہوئے، بلکہ عصری زندگی کو اپنے عہد کے تازہ محاورہ میں لکھنے کی کوشش کی۔

گھر کے باہر قبرستان
گھر کے اندر تنہائی

گونجتی رہ گئی صدا میری

لفظ نکلے نہ تمہے مرے سب سے

سانسوں میں آگ، لب پہ دھواں، رخ پہ دھند ہے
تم نے یہ کیسے شخص کی تصویر کھینچ لی

ہر ایک سوچ کی کھڑکی سے پھوٹتی ہے کرن
نہ جانے کون سا مینار ہے مرے اندر

میں مہکتی ہوئی ہر رات کا قاتل ہوں مگر
میری آنکھوں میں مرے قتل کا منظر نہ اتار

روز بن برسے گزر جائیں گے بادل کب تک
اپنے اشکوں سے صبا ان کو بھگونا اک دن

کبھی ظاہر میں وہ نہیں موجود
پھر یہ باطن میں شان کس کی ہے

تمھاری یاد کے شعلوں کی آبرو کے لیے
سلگ کے بجھ گئے ایسے دھواں ہوئے ہم لوگ

زمانہ پوچھ رہا تھا زمیں بھی ششدر تھی
ورق ورق پہ نمایاں یہ نام کس کا تھا

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ صبا نویدی لفظوں کے مزاج شناس ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور معنی خیز تراکیب کے استعمال سے اپنے کلام میں ایک طرف عصری حسیت کو سمو دیتے ہیں تو دوسری طرف اشعار کی تہہ داری یا مفاہیم کی ایک سے زاید سطحیں پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ علیم صبا نویدی کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ ان کی شعری تخلیقات کہنہ اور فرسودہ حصاروں اور

تقلیدی قطاروں کو توڑ کر اپنا اظہار کرتی ہیں۔ان کا یہی رویہ انھیں جدید غزل گو شعرا میں اہمیت سے ہم کنار کرتا ہے۔ان کے کلام میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو زندہ شاعری کا حصہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔صبا نویدی کے رنگ تغزل کو دور حاضر کے متعدد نقادوں نے اپنے اپنے انداز میں سراہا ہے۔برصغیر ہندو پاک کے چند نقادوں کے تاثرات ملاحظہ ہوں

"علیم صبا نویدی کی غزلوں میں جو نیا لہجہ ہے وہ بڑا کشش انگیز ہے" — فراق گورکھپوری

"علیم صبا نویدی نے صرف اس دور کے معروف اور مقبول موضوعات کی عکاسی ہی نہیں کی بلکہ ذاتی نظر اور تجربے کو بھی شعر کا جامہ پہنایا ہے۔" — پروفیسر آل احمد سرور

"علیم صبا نویدی کی غزلوں میں نیا احساس، نیا رنگ اور نیا اسلوب سبھی کچھ ہے۔" — ڈاکٹر وارث علوی

"مجھے علیم کے اشعار میں دوہری معنویت نظر آتی ہے ایک سطح پر یہ علیم صبا کے اپنے واردات ہیں تو دوسری گہری سطح پر ان کے ذریعے علیم نے اپنے عصر سے اپنا رابطہ استوار کیا ہے" — ڈاکٹر سلیم اختر

"علیم صبا پوری آگہی اور دردمندی سے شخصی سطح پر محسوس کیے گئے تجربات کو پیکر اور علامت میں اسیر کرتے ہیں۔ان کی تاثیر پذیری میں خلوص اور شدت ہے۔وہ لفظوں کی طلسمی کیفیت کو بیدار کر کے قاری کو لاشعوری دنیاؤں میں سفر کراتے ہیں۔" — ڈاکٹر حامدی کاشمیری

"علیم صبا نویدی شاعری کے بارے میں بہت سنجیدہ ہیں اور نئی جہتوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ان کے ہاں تخیل کی بھی فراوانی ہے۔" — شمس الرحمن فاروقی

"نئی شاعری سماجی شعور سے دور رہ کر یا اسے رد کر کے بہت

آگے نہیں جا سکتی اس شعور اور احساس سے پیدا ہونے
والے تجربے کو نیا لہجہ اور نئے طریقِ اظہار میں ڈھال سکتی
ہے اور یہ رمز نویدی نے پالیا ہے۔اس لحاظ سے نویدی کی
غزلیں آتشِ رفتہ کے سراغ سے خالی ہیں اور نہ نئے دور
کی بجلیوں سے۔

ڈاکٹر محمد حسن

"اردو شاعری کی روایات اور کلاسکس سے جن نئے شعرا نے
اپنے رشتے کو استوار رکھا اور مضبوط رکھا ہے۔ علیم صبا
نویدی ان میں سے ایک ہیں۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

"علیم صبا نویدی نے اپنے مشاہدات، زمانے کی تلخیوں سے
سمیٹے ہیں انھوں نے زندگی پر محبت کی نظر ڈالنے کی کوشش
نہیں کی ایک مبرم کرب ان کی غزل پر چھایا ہوا ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید

"نئی غزل کو انھوں نے بہت کچھ دیا ہے۔ وہ ارتقا کے تخلیق
کار ہیں۔ ان کی نئی طرز احساس کی غزلیں ان کی انفرادیت
کا تشخص ہیں۔"

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

ناقدان ادب کے ان تاثرات کے مطالعہ کے بعد ادب کا کوئی بھی باذوق قاری بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ علیم صبا نویدی ایک فطری اور جدید طرز احساس کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے اسلوب بیان اور طرزِ فکر کی بنا پر عصری اردو شاعری کے معتبر سخن وروں میں بحیثیت غزل گو منفرد مقام بنالیا ہے۔ ان کی فکر پامال راستوں سے گزرنے کے بجائے نئی نئی جہتوں کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ ان کا اسلوب، طرزِ احساس اور تجربوں کی جانب ان کا رویہ کسی دوسرے شاعر سے میل نہیں کھاتا۔

حوالے و حواشی:

(۱) علیم صبا کے افسانے سب سے پہلے ایک شراکتی تصنیف "روشنی کے بھنور (۱۹۶۷ء) میں شائع ہوئے۔

(۲) زیرِ نگرانی پروفیسر ناز قادری۔

(۳) زیرِ نگرانی ڈاکٹر محمد انور الدین۔

(۴) خامہ در خامہ۔ڈاکٹر محمد علی اثر۔ ص ۷۔

"عکس در عکس"۔ ایک مطالعہ

علیم صبا نویدی بحیثیت شاعر اور نثر نگار، اپنی چند نمایاں اور منفرد خصوصیات کی بنا پر اردو کے ادبی حلقوں میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ شاعری کے میدان میں حمد و نعت اور نظم و غزل کے علاوہ ہائکو، سانیٹ اور آزاد غزل جیسی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر کے انھوں نے اہل نظر سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ علیم صبا محض شاعر ہی نہیں بلکہ افسانہ نویس اور محقق بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کے اب تک تین مجموعے اور تحقیقی مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ وہ خود کئی کتابوں کے مرتب و مؤلف بھی ہیں۔ اور بعض ناقدین نے، ان کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر علاحدہ علاحدہ کتابیں بھی مرتب کی ہیں۔ علیم صبا نویدی کے فکر و فن اور ادبی کارناموں کے تعلق سے تفصیلی معلومات، مختلف کتابوں میں مل جاتی ہیں لیکن ان کی نجی زندگی اور ذاتی شخصیت ہنوز پراسراریت کے پردوں میں پوشیدہ رہی ہے۔ ان کی تعلیم، ملازمت اور تصانیف کے سلسلہ میں معلومات تو ان کی کسی بھی کتاب میں بہ آسانی دست یاب ہو جاتی ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے ان کی حیات اور شخصیت پر سیر حاصل کام کی ہنوز کمی محسوس ہوتی رہی ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ یعقوب اسلم صاحب نے زیر نظر تصنیف (عکس در عکس) میں علیم صبا کی حیات کے مختلف مدارج اور ان کی نجی زندگی کے متنوع پہلوؤں کے علاوہ شخصی اوصاف کو بھی بھرپور خاکے میں پیش کیا ہے۔ یعقوب اسلم کی تحریر میں علیم صبا نویدی کو ہم ایک جیتے جاگتے گھریلو کردار کی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں جو کبھی ملازمت کی مصروفیات میں گھرا ہوا نظر آتا ہے ۔۔۔۔ کبھی مختلف النوع احباب کی محفلوں میں ہنستا بولتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی اپنے ادبی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہے۔

یہ بات محض علیم صبا کے لیے باعث خوش قسمتی نہیں کہ ان کی حیات اور

شخصیت کو منظر عام پر لانے کے لیے یعقوب اسلم جیسے رفیق دیرینہ اور ہم راز و دم ساز نے قلم اٹھایا ہے بلکہ ان کی فکر و فن سے دل چسپی رکھنے والے قارئین ادب اور ریسرچ اسکالروں کے لیے بھی باعث شادمانی ہے۔ یعقوب اسلم صاحب نے صبا نویدی کو جلوت و خلوت میں بھی دیکھا ہے اور احباب کی محفلوں میں بھی۔ مزید برآں وہ ان کی زندگی کے بعض اہم حادثات و واقعات کے چشم دید گواہ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ علم صاب کی زندگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر کتاب کی شکل میں ترتیب دینے سے قبل انھوں نے اس موضوع پر تحقیقی کام کرنے والے مختلف ریسرچ اسکالروں کو ان کی ضروریات کے تحت درکار مواد فراہم کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ اس لحاظ سے یعقوب اسلم ہی وہ موزوں ترین شخصیت ہیں جنھیں اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ صبا نویدی کی متنوع شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سپرد قرطاس کریں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یعقوب اسلم صاحب اپنے اس فریضے سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

یعقوب اسلم صاحب نے محض صبا نویدی کی زندگی اور شخصیت کو متعارف کروانے کی ذمے داری ہی نہیں نبھائی ہے بلکہ ان کے خاندان کے بزرگوں سے ہوتے ہوئے موجودہ افراد خاندان، اہلیہ اور اولاد کے تعلق سے بھی معلومات کو زیر قلم لایا ہے۔ علیم صبا کا خاندانی سلسلہ ننھیال اور ددھیال دونوں جانب سے ہندستان کے سربرآوردہ بزرگان دین سے ملتا ہے۔ یہ معلومات علیم صبا کی نجی شخصیت ہی کو نہیں بلکہ ان کے فن کے اہم گوشوں مثلاً خدا پرستی، عشق محمدی، دینی معتقدات اور روحانیت سے لگاؤ جیسے موضوعات کو بھی منعکس کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے مشترکہ خاندان کی تصویر کشی اور ان کے اپنے بھائیوں بہنوں اور ان کے متعلقین سے خوش گوار تعلقات اور برتاؤ کی تفصیلات بھی یعقوب اسلم صاحب نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ یکجا کر دی ہیں۔

علیم صبا نویدی کی ابتدائی زندگی، لڑکپن اور تعلیم و تربیت جیسے اہم واقعات حیات کی بولتی ہوئی تصویروں سے اسلم صاحب نے اپنے خاکے کو سجایا ہے اور اس سلسلے میں بڑے دل چسپ اور حیرت انگیز انکشافات بھی کیے ہیں۔ علیم صبا کی تعلیم

سے عدل دل چسپی، کھلنڈرے پن، خود پسندی اور غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کی بھی اسلم صاحب بڑے بے لاگ انداز سے نشاندھی کی ہے۔مزید برآں ان اہم تبدیلیوں کو بھی بے نقاب کیا ہے، جو ان کی بعد کی زندگی میں رونما ہوئی ہیں۔ جیسے صبا نویدی کا سنجیدگی کے ساتھ تعلیم کی طرف راغب ہونا۔۔۔ گریجویشن کا امتحان امتیازی حیثیت سے کامیاب کرنا اور اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر خود کو مطالعہ کے لیے وقف کر دینا۔ ان تمام پہلوؤں کو یعقوب اسلم صاحب نے، بڑے دل کش اسلوب اور ماہرانہ انداز سے تجزیہ کرتے ہوئے سپردِ قلم کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علیم صبا نویدی کی شخصیت کو متحرک اور ارتقاپزیر بنانے میں درحقیقت انھیں متضاد خصوصیات نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔

علیم صبا نویدی کی لڑکپن کے واقعات حیات کو پیش نظر رکھیں تو ان کا حصول تعلیم کی طرف راغب ہونا ہی ایک غیر معمولی کارنامہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن سب سے اہم ترین بات ان کے اندر چھپے ہوئے تخلیقی فن کار کا خود کو ظاہر کرنا ہے۔ آج علیم صبا ایک متنوع اور رنگارنگ تخلیقی شخصیت کے حامل فن کار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں متعارف و مقبول ہیں لیکن اس مقام تک وہ پلک جھپکتے ہی نہیں پہنچے ۔۔۔ان کی ابتدائی شعری کاوشوں اور افسانہ نگاری کی کوششوں کو پروان چڑھانے میں مدراس کے باذوق ادیب و شاعر دوستوں کے علاوہ اکابرین ادب اور ادبی دانش وروں کی جانب سے ان کی ذہنی تربیت اور رہنمائی بھی اہمیت رکھتی ہے۔ خود علیم صبا نے ان اہم شخصیتوں سے استفادہ کرنے کا بارہا اعتراف کیا ہے۔ علیم صبا نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک اپنے نقطہ۔ عروج کو پہنچ چکی تھی لیکن یہ تحریک ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھی اور علیم صبا نے اپنے طور پر جدیدیت کی سمت سفر اختیار کیا۔ ترقی پسندی سے جدیدیت تک کے مراحل اور جدیدیت اختیار کرنے کے بعد بھی اپنی انفرادیت اور تنوع پسندی کو نکھارنا کوئی سیدھا سادا عمل نہیں ۔۔۔ یعقوب اسلم نے بڑی باریک بینی سے ان تمام پیچیدگیوں کو نہایت دل کش انداز سے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ شہر مدراس کی وہ مختلف محفلیں جہاں رات دن ادبی اور علمی مباحثے ہوا کرتے تھے اور جن میں

کبھی کبھی نام ور اہل قلم کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔۔۔۔اور کم عمر ادیب اور شعرا ان مباحثوں میں شامل ہو کر استفادہ کیا کرتے تھے۔ ان سب مناظر کی یعقوب اسلم صاحب نے خوب صورت اور موثر پیرائے میں تصویر کشی کی ہے۔

علیم صبا کی زندگی کا غالباً اہم ترین سانحہ ان کی پہلی شادی اور مزاج و ماحول کی عدم مطابقت کی بنا پر علاحدگی کا ہے۔ یہ واقعہ نہ صرف ان کی شخصی زندگی پر اثرانداز ہوا بلکہ ان کے تخلیقی ذہن کے دھارے کو موڑنے کا بھی باعث بنا۔ کن وجوہات کی بنا پر یہ شادی ناکام رہی اور وہ کیا اثرات تھے جو علیم صبا نویدی کی فکر و فن پر مرتسم ہوے ان تمام پہلوؤں کا یعقوب اسلم صاحب نے غیر جانبدارانہ، بے لاگ اور ثقہ انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ اس واقعہ کے پہلو بہ پہلو صبا نویدی کی دوسری اور خوش گوار شادی اور ان کی آسودہ ازدواجی زندگی کی تفصیلات بھی یعقوب اسلم صاحب نے اپنے ذاتی مشاہدے کے ذریعے مستند انداز سے بیان کیے ہیں۔ یہ ایسے معاملات ہیں جن پر لکھنے کا حق اسلم صاحب کو ہی پہنچتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ علیم صبا نویدی کے ہم دم و ہم راز ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ علیم صبا کی تخلیقی کاوشوں سے ان واقعات کا رشتہ جوڑنے کا فن بھی جانتے ہیں۔

صبا نویدی کی زندگی کے شب و روز. ان کا گھریلو ماحول. ان کا اپنی اہلیہ اور اکلوتی بیٹی سے شفقت آمیز برتاؤ اور ان کے فلاح و بہبود کا خیال ایسے عناصر ہیں جنھوں نے علیم صبا کی شخصیت کو ہمہ جہت اور پہلو دار بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں وہ ذہنی آسودگی نصیب ہوئی جس کے سبب وہ نہ صرف شاعری اور افسانہ نگاری بلکہ علمی، انتقادی اور خاص طور پر تحقیقی کارنامے بھی انجام دے سکے۔ ان تمام باتوں کو یعقوب اسلم صاحب نے نہایت دیانت داری کے ساتھ اپنے خاکے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ازدواجی زندگی کے ساتھ ساتھ، کسی تخلیقی فن کار کی اپنی شخصی زندگی اور اس کا ذریعہ۔ معاش بھی اس کی فکر و فن پر اثرانداز ہوتا ہے۔ علیم صبا نویدی ملازمت کے سلسلے میں مدراس پورٹ ٹرسٹ سے وابستہ ہیں۔ لیکن اس سے قبل بھی روٹی روزی کے چکر میں انھوں نے جو پاپڑ بیلے ہیں اور یہاں وہاں عارضی ملازمتیں کی ہیں،

ان کی تفصیلات بھی یعقوب اسلم صاحب نے بڑی تفصیل سے بیان کی ہیں۔ صبا نویدی اپنی موجودہ ملازمت کے فرائض کس دیانت داری سے انجام دیتے ہیں اور اپنے پیشے کی مصروفیت کے باوجود ادبی ہنگامے برپا کرتے ہیں اور مدراس پہنچنے والے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی سربراہی اور مہمان نوازی کے لیے کس طرح وقت نکال لیتے ہیں۔ ان تمام چشم دید واقعات کا پرلطف بیان اسلم صاحب کی تحریروں میں ملے گا۔

علیم صبا نویدی کی تخلیقی شخصیت سے تو اردو ادب کا ہر سنجیدہ قاری واقفیت رکھتا ہے لیکن ان کے برصغیر ہندوپاک کے تقریباً تمام لکھنے والوں سے جو مراسم اور دوستانہ تعلقات ہیں۔ اس بات سے بھی ان کے بہت کم قارئین واقف ہوں گے۔ علیم صبا نویدی نے نہ صرف خط وکتابت کے ذریعے بلکہ بذات خود بھی دور دراز کا سفر کرکے اردو کے اہم لکھنے والوں سے مستقل ربط ضبط قائم رکھا ہے۔ ملک کے کسی بھی علاقے سے مدراس پہنچنے والے مصنفین کو تو خیر وہ اپنا شخصی مہمان بنا ہی لیتے ہیں لیکن تمل ناڈو اور کرناٹک کے ادبا اور شعرا سے تو گویا ان کی قرابت داری ہے۔ اہل قلم حضرات سے ان کا میل جول چاہے کسی بھی نوعیت کا ہو لیکن اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں یہ بات خوش آئیند ہے کہ وہ اردو کے مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کی ذمے داری بھی نہ صرف خوش دلی اور رضاکارانہ طور پر قبول کرلیتے ہیں بلکہ کتابت سے اشاعت تک کے تمام دشوار گزار مراحل کو طے کرتے ہوئے انھیں نہایت دیدہ زیب اور پرکشش انداز سے دنیائے اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کی متعدد کتابیں ان کی انتھک کاوشوں کا ثمرہ ہیں۔ یعقوب اسلم صاحب نے ان کی ایسی تمام ہنگامہ آرائیوں کا رکارڈ اپنے خاکے میں محفوظ کر دیا ہے۔

"عکس در عکس" کے مطالعے کے بعد یہ ممکن نہیں کہ کوئی بھی باذوق قاری علیم صبا کی ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت کا عرفان حاصل کرنے سے محروم رہ جائے۔

وہ اولیا اللہ کے خاندان میں پیدا ہوئے، خود ولی نہیں لیکن ولی صفت ضرور ہیں۔

علیم صبا نویدی اس لیے خوش نصیب ہیں کہ انھیں یعقوب اسلم جیسا خاکہ نگار ملا۔ اور یہ یعقوب اسلم صاحب کی خوش بختی ہے کہ انھیں اپنے فن کے اظہار کے لیے

علیم صبا جیسی مختلف النوع العباد کی حامل شخصیت ہاتھ آئی۔ یعقوب اسلم صاحب بذات خود ایک صاحب طرز ادیب اور منفرد انشا پرداز ہیں۔ مختلف موضوعات پر تحریر کی ہوئی ان کی متعدد تصانیف، اردو زبان و ادب سے ان کی وابستگی کا ثبوت مہیا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ علیم صبا کی پہلو دار شخصیت پر قلم اٹھانا اور اسے فن کارانہ حسن کے ساتھ لفظوں کا جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اسلم صاحب نے جس اہم اور بکٹ ذمے داری کو قبول کیا اسے پوری طرح نبھایا بھی ہے۔ علیم صبا سے گہری واقفیت کی وجہ سے انھیں وافر مواد اکٹھا کرنا تو مشکل نہیں تھا لیکن لفظوں کے ملبوس میں ایک جیتی جاگتی شخصیت کو منتقل کرنا انھیں کا حق تھا۔ علیم صبا سے دیرینہ مراسم کے باوجود انھوں نے بے لاگ انداز سے ان تمام خوبیوں اور خامیوں کو نمایاں کیا ہے جو انھیں علیم کی شخصیت میں نظر آئیں۔ علیم صبا کی زندگی کے پے چیدہ اور ناخوش گوار عوامل اور واقعات سے بھی انھوں نے چشم پوشی نہیں کی۔ سچ پوچھیے تو یہ ان کی فن کاری کا کمال ہے کہ ایسے تمام واقعات اور معاملات کو انھوں نے ثقہ اور مناسب ترین لفظوں میں قارئین تک پہنچا دیا ہے۔ اس طرح یعقوب اسلم صاحب اپنے تاثرات کو قاری کے ذہن پر من و عن مرتب کرنے میں پوری پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

زیرِ نظر خاکے کی اہمیت صرف اتنی نہیں کہ علیم صبا نویدی جیسی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے بلکہ اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں اس سلسلے کو آگے بڑھاتی ہے جو طویل خاکہ نگاری کی تعریف میں آتا ہے۔ مولوی عبدالحق سے مجتبیٰ حسین تک بیسیوں خاکہ نگاروں نے مختصر خاکہ نگاری کے فروغ میں اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے لیکن اردو میں طویل خاکہ نگاری کے نمونے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ کا اولین خاکہ فرحت اللہ بیگ کا "نذیر احمد کی کہانی" ہے۔ عصمت چغتائی کا اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر لکھا ہوا خاکہ "دوزخی" بھی اسی قبیل سے ہے۔ یعقوب اسلم صاحب نے علیم صبا کے خاکے کے ذریعے اسی روایت کو بڑھاوا دیا ہے۔ اس خاکے میں شخصیت علیم صبا کی ہے لیکن اس کے پس پردہ خاکہ نگار کی سحر طراز شخصیت اپنے فن کا جادو جگاتی دکھائی دیتی ہے۔

ولی اورنگ آبادی

(کتابیات)

ولی دکنی، قدیم اردو کا ایک قدآور اور باکمال سخن ور ہے۔ اس کے نام اور وطن کے بارے میں محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اردو شاعروں کے مختلف تذکروں میں اس کے مختلف نام جیسے ولی محمد۔ محمد ولی۔ ولی اللہ۔ شمس ولی اللہ یا شاہ ولی اللہ ملتے ہیں۔ اسی طرح بعض تذکرہ نویس اس کو اورنگ آباد کا باشندہ بتاتے ہیں اور بعض گجرات کا۔ جہاں تک نام کا تعلق ہے، درج ذیل شواہد کے پیش نظر اس کا نام "ولی محمد" تسلیم کر لینے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

۱۔ دیوان ولی کے قدیم ترین مخطوطات، جن میں ولی کے عزیز ترین دوست سید ابوالمعالی کے فرزند سید محمد تقی (۱) اور ولی کے شاگرد رشید ثناء اللہ کے مکتوبہ نسخے بھی شامل ہیں، ان میں ولی کا نام ولی محمد بتایا گیا ہے۔

۲۔ تذکرہ "گلشن گفتار" مولفہ حمید اورنگ آبادی، (۱۷۵۱ء) اردو کے قدیم تذکروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں بھی ولی کا نام "ولی محمد" تحریر کیا گیا ہے۔

نام کی طرح ولی کے مقام پیدائش کے سلسلے میں بھی محقیقن کو اختلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شاعر نے آنے والے زمانے میں اردو شعر و سخن کے دھارے کو موڑنے میں جو عظیم رول انجام دیا ہے اس کی وجہ سے اردو زبان و ادب کے بعض عالموں نے اس کو اپنے مخصوص صوبوں سے منسوب کرنے کی کوشش کی۔ ولی کے بچپن کے واقعات حیات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ لڑکپن اور نوجوانی کے زمانے میں اس نے کچھ عرصہ گجرات اور خاص طور پر احمد آباد میں قیام کیا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر ان کے کلام میں ملتا ہے۔ شہر سورت کے متعلق ایک مثنوی بھی

ان کے دیوان میں موجود ہے۔ احمد آباد اور سورت کے حوالوں کی وجہ سے گجرات کے بعض اہل علم نے اس بات کا ادعا کیا ہے کہ ولی کا وطن گجرات ہے اور نوجوانی کے زمانے میں کسی وقت وہ اورنگ آباد آئے اور یہیں بس گئے۔ اس کے برخلاف زمانہ قدیم کے مورخین اور محققین سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی تک اس امر پر متفق ہیں کہ ولی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، ان کا بچپن اسی شہر میں گزرا، اگرچہ نوجوانی کے زمانے میں انھوں نے گجرات کا سفر ضرور کیا ہوگا۔

ولی کے مقام پیدائش کے سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ "تاریخ احمدی" (مصنفہ۔ مٹھن لال ۱۷۳۷ء) اور "تحفتہ الکرام" (مصنفہ۔ علی شیر قانع) احمد آباد کی ایسی تاریخیں ہیں جن میں ولی کا نام نہیں ملتا۔

ولی ایک جہاں گرد شاعر تھا، اس کے شوق سیاحت کی شہادت کم و بیش تمام تذکرے دیتے ہیں۔ اس نے نہ صرف سید ابو المعالی کی معیت میں دہلی کا سفر کیا تھا بلکہ جنوبی ہند کے بھی کئی شہروں کی سیاحت کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے حج بھی کیا تھا اور مدینہ۔ منورہ کی زیارت کی سعادت بھی حاصل کی تھی (۳)۔

احسن مارہروی کا بیان ہے کہ ولی ۱۰۷۹ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے (۴)۔ مولوی عبدالحق نے کتب خانہ۔ جامع مسجد۔ بمبئی کے ایک قلمی نسخے میں درج قطعہ تاریخ کو بنیاد بنا کر ولی کی تاریخ وفات ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء بتائی تھی اور ایک عرصے تک اسے مستند سمجھا جاتا رہا (۵)۔ حال ہی میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مولوی صاحب کی اس تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے ۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۰ء تک ولی کے بقید حیات رہنے (۶) اور ۱۱۳۸ھ / ۱۷۲۵ء سے پہلے کسی وقت وفات پانے کی اطلاع دی ہے (۷)۔

عہد قدیم ہی میں "دیوان ولی" کی وسیع پیمانے پر پذیرائی ہوئی بہ قول "محمد حسین آزاد" جب "دیوان" ولی پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا، قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت نے زبان سے پڑھا۔ گیت موقوف ہوگئے۔ قول معرفت کی محفلوں میں اس کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ ارباب نشاط احباب کو سنانے لگے۔ جو موزوں طبیعت رکھتے تھے۔ انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا (۸)۔ کلام ولی کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ "دیوان ولی" کے

سینکڑوں مخطوطات نہ صرف ہندوپاک کے سرکاری، نیم سرکاری یا نجی کتب خانوں کی زینت ہیں بلکہ یورپ اور امریکہ کی لائبریریوں میں بھی محفوظ ہیں۔ اکرام چغتائی نے اپنے ایک مضمون "دیوان ولی کے قلمی نسخے" میں ولی کے قلمی دواوین کے ۱۱۸ نسخوں کی تفصیل شائع کی ہے (۹)۔ ان مخطوطات کے علاوہ مشفق خواجہ نے اپنی کتاب "جائزۂ مخطوطاتِ اردو" میں مزید ۱۹ نسخوں کی نشان دہی کی ہے (۱۰)۔

ولی کا دیوان متعدد بار شائع ہوا ہے۔ سب سے پہلے مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے ولی کے دیوان کو کئی نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے ۱۸۳۳ء میں پیرس کے چھاپے خانے سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں غزلوں کے تراجم، حواشی اور مقدمہ فرانسیسی زبان میں ہے۔ سرورق کی عبارت درج ذیل ہے:

" دیوان ولی چھاپا ہوا اہتمام سے غرسیں دتاسی کے شہر پاریز کے بادشاہی چھاپے خانے میں سنہ ۱۸۳۳عیسوی مطابق ۱۲۴۹ہجری " (۱۱)۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد مطبع حیدری۔ بمبئی (۱۲۹۰ھ) اور جید پریس۔ دہلی (۱۹۲۱ء) سے "دیوان ولی" کے جو ایڈیشن شائع ہوئے ان میں ترتیب و تدوین کے اصولوں کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں احسن مارہروی نے "دیوان ولی" کو ۹ قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے مرتب کر کے انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے شائع کیا تھا، جس میں ۴۲۲ غزلیں، ۶ قصیدے، ۱۲ مخمسات، ۷ مستزاد، ۲ ترجیع بند، ۲ مثنویاں، ۶ قطعات، ۲۶ رباعیاں اور ۴۰ فردیات شامل ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں دو ضمیمے بھی ہیں ضمیمہ اول میں مزید چند مخطوطات کے زاید اشعار درج کیے گئے ہیں اور ضمیمہ دوم میں بعض نسخوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ۱۹۴۵ء میں نور الحسن ہاشمی نے "کلیات ولی" کو از سر نو ۱۴ قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے تقابل کر کے انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے شائع کیا تھا۔ اس میں احسن مارہروی کے مرتبہ کلیات کے مقابلے میں زاید کلام شامل کیا گیا ہے۔ دیوان ولی کی متعدد اشاعتوں کے باوجود اب تک بعض مخطوطات اور بیاضوں میں اس کا غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی زبان و بیان، اس کا طرز اظہار اور لسانی اجتہاد، اہل جنوب اور اہل شمال دونوں کے لیے قابل قبول تھا۔ بحیثیت شاعر ولی کا موازنہ انگریزی کے سخنور چاسر سے اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس نے اردو شاعری کی روایت کو فروغ دینے میں بالکل اسی طرح کامیابی حاصل کی جس طرح چاسر نے انگریزی شاعری کے لیے کی۔ واقعہ یہ ہے کہ ولی اردو شاعری کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ایک طرف اردوے قدیم کی عظیم شاہ راہ اختتام کو پہنچتی ہے، تو دوسری طرف شمالی ہند میں ولی کے زیر اثر اردو شاعری کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ میں، ولی ایک ایسا شاعر ہے، جس نے امکانات کا وسیع راستہ آنے والے شعرا کے سامنے کھول دیا اور جس پر چل کر اردو غزل وہاں پہنچ گئی جہاں وہ آج نظر آتی ہے۔ ولی کے بعد آنے والے شعرا نے غزل کو بنیادی صنف سخن کی حیثیت سے قبول کر لیا اور ولی کی غزل کے رجحانات اردو غزل کے بنیادی رجحانات بن گئے۔ یہ بات یاد رہے کہ آگے چل کر جتنے رجحانات نمایاں ہوئے، وہ خواہ عشقیہ شاعری کا رجحان ہو یا ایہام پسندی کا، لکھنوی شاعری کی جارحیت ہو یا مسائل تصوف کی شاعری ہو یا ایسی شاعری ہو جس میں داخلیت اور رنگارنگ تجربات کا بیان ہو یا اصلاح زبان کی تحریک ہو۔ سب کا مبدا ولی ہے (۱۲)۔

ولی نے نہ صرف دکنی شاعری کے بنیادی رجحانات اور روایات کی توسیع کی بلکہ جنوب اور شمال کی شعری روایات کو ایک ادبی وحدت میں منسلک کر کے ایسا تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا کہ تمام ہندستان کے چھوٹے بڑے سبھی شاعروں نے اس کو اپنا ادبی رہنما تسلیم کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ آباد کے سراج (۱۳)، داود (۱۴) اور فدوی (۱۵)، گجرات کے اشرف (۱۶) سندھ کے میر محمود صابر (۱۷) مدراس کے شاہ قربی (۱۸) اور شاہ تراب (۱۹)۔ دہلی کے شاہ حاتم (۲۰)، آبرو (۲۱)، اور ہبتلا (۲۲) سے میر (۲۳) تک سبھی شاعروں نے اپنے کلام میں ولی کا نام عزت اور احترام سے لیا ہے۔

دیوان ولی کے قلمی نسخے: ادارۂ ادبیات اردو۔ حیدر آباد۔

سنہ کتابت	مخطوطہ نمبر	اوراق / صفحات		کیفیت
۱۔ قبل ۱۱۲۸ھ	۸۲۱ / ج ۴	۱۱۱	--	کلیات
۲۔ قبل ۱۲۲۸ھ	۸۲۰ / ج ۴	۱۱۴	--	کلیات
۳۔ قبل ۱۱۵۰ھ	۸۱۶ / ج ۴	۱۶۳	--	دیوان
۴۔ قبل ۱۱۵۲ھ	۶۷۷ / ج ۳	۱۲۴	--	کلیات
۵۔ ۱۱۵۶ھ	۹۳ / ج ۱	۱۳۸	--	دیوان
۶۔ ۱۱۹۱ھ	۱۱۲ / ج ۱	۹۲	--	دیوان
۷۔ ---	۱۷۴ / ج ۱	۳	--	بیاض
۸۔ ---	۸۹۶ / ج ۴	۴	--	بیاض
۹۔ ---	۱۲۷۹ / ج ۶	۷۷	--	دیوان

اڈنبرا یونیورسٹی لائبریری:

سنہ کتابت	مخطوطہ نمبر	اوراق / صفحات		کیفیت
۱۔ ۱۱۵۳ھ	۳۷۸	۹۵	--	دیوان

اکسفورڈ یونیورسٹی لائبریری:

سنہ کتابت	مخطوطہ نمبر	اوراق / صفحات		کیفیت
۱۔ ۱۱۵۳ھ	586/Addl.	۹۵	--	دیوان
۲۔ ---	46	۱۲۵	--	دیوان

انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد:

سنہ کتابت	مخطوطہ نمبر	اوراق / صفحات		کیفیت
۱۔ ۱۲۴۱ھ	---	---	--	دیوان

انجمن ترقی اردو کراچی:

١۔	١١٣٥ھ	ق ٣/ ١٩٣	٩٥	--	دیوان
٢۔	---	ق ٣/ ١٩٣	١٣١	--	دیوان
٣۔	١١٣١ھ	٤٥٧	--	--	دیوان
٤۔	---	٤٥٨	--	--	دیوان

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی:

١۔	١٣٣٨ھ	---	٩٥	--	دیوان
٢۔	---	ناقص الاول وآخر	--	--	دیوان
٣۔	---	ناقص الآخر وکرم خوردہ	--	--	دیوان
٤۔	---	---	اس نسخہ کو حکیم شمس اللہ قادری نے مولوی عبدالحق کے لیے نقل کروایا تھا		

انڈیا آفس (لندن):

١۔	١١٤٤ھ	113	١١٠	--	دیوان
٢۔	١١٥٥ھ	114	٢١٢	--	دیوان
٣۔	١١٥٥ھ	115	١٣٤	--	دیوان
٤۔	١٢٨٠ھ	116	١١٦	--	دیوان
٥۔	١٢٨٠ھ	117	١٠٦	--	دیوان
٦۔	١٢٨٠ھ	118	٨٥	--	دیوان
٧۔	١٢٨٠ھ	119	١٠٧	--	دیوان
٨۔	١٢٨٠ھ	120	٧٢	--	دیوان

اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) حیدرآباد:

١۔	١١١٥ھ	1637	٢٣٢	--	دیوان
٢۔	---	1589 M	--	١٦٦	دیوان
٣۔	---	1599 M	--	٢٤٦	دیوان

۴۔	---	3146 M	--	۲۰۶	کلیات
۵۔	---	(579) 315	--	--	انتخاب کلام
۶۔	۱۱۵۹ھ	792 M	۱۱۲	--	دیوان
۷۔	---	1637 M	۱۱۶	--	کلیات
۸۔	---	15 M	۱۳	--	منتخب کلام
۹۔	۱۳۰۴ھ	5012 M	۲۰	--	دیوان

اورینٹل مینو اسکرپٹ لائبریری ۔ مدراس:

۱۔	---	--	۱۲۰	--	دیوان

ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری ۔ کلکتہ:

۱۔	۱۱۴۶ھ	237	--	--	--
۲۔	---	64	--	--	--

ببلیوتیک ناسیول ۔ پیرس:

۱۔	---	836	--	۷۸	دیوان

برٹش میوزیم ۔ لندن:

۱۔	---	204054/Addl.	--	۳۴	دیوان
۲۔	۲۰ شعبان ۱۳۲۴	6327 / Addl.	--	--	انتخاب

بھولاناتھ لائبریری ۔ احمد آباد:

۱۔	---	--			اب یہ نسخہ ورنیکولر سوسائٹی احمد آباد کے کتب خانے میں ہے

پنجاب پبلک لائبریری ۔ لاہور:

۱۔	---	--	۴۵	--	دیوان

کتب خانہ۔ جامع مسجد۔ بمبئی:

۱۔ --- UM 102 / 218 -- ۲۱۰ دیوان
۲۔ --- UM 103 / 219 -- ۱۹۰ دیوان

کتب خانہ۔ جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد:

۱۔ ۱۲۱۳ھ ۷ز۷ ۲۳۰ -- دیوان

کتب خانہ۔ جامع نظامیہ۔ حیدرآباد:

۱۔ --- -- -- -- دیوان

جوریلینڈز لائبریری۔ مانچسٹر:

۱۔ ۱۲۲۳ھ ۲۷ ۷۵ -- دیوان

خدابخش لائبریری۔ پٹنہ:

۱۔ --- ۱۲۵ ۱۲۵ -- دیوان
۲۔ ۱۱۲۰ھ ۱۲۶ ۸۳ -- دیوان
۳۔ --- ۱۲۸ ۲۹ -- دیوان

ذخیرۂ پروفیسر محمود شیرانی۔ لاہور:

۱۔ ۱۱۳۸ھ ۱۵۰۵ ۱۰۱ -- دیوان

سبحان اللہ اورینٹل پبلک لائبریری۔ علی گڑھ:

۱۔ ۱۱۸۵ھ ۸۹۱/۴۳۱۱/۵ ۹۴ -- دیوان

قاضی عبید اللہ لائبریری۔ مدراس:

۱۔ ۲۰ رجب ۱۱۶۷ ۴۹/۹۱۸ ۱۳۳ -- دیوان

قومی عجائب گھر۔ کراچی:

۱۔ ۱۹۵۷ء ۶۵۴/۱۶ ۷۸ -- دیوان

۲۔	۱۹۵۸ء	۲۴۵/۱۰	۴۱	ـــ	دیوان

کامالائبریری۔ بمبئی:

۱۔	۱۱۴۰ھ	---	۳۷۵ (غزلیں)		دیوان

کتب خانہ۔ اہل اسلام۔ مدراس:

۱۔	---	۲۳۰۶	---	---	دیوان
۲۔	---	۲۳۰۷	---	---	دیوان

کتب خانہ۔ پیر محمد شاہ۔ احمد آباد:

۱۔	۱۱۹۷ھ	---	---	---	دیوان

کتب خانہ۔ عرفانیہ۔ فوٹونک:

۱۔	۱۲۳۳ھ	---	---	---	دیوان

کتب خانہ منارہ مسجد۔ بمبئی:

۱۔	۱۲۲۵ھ	---	---	---	دیوان

کیمبرج یونیورسٹی۔ لائبریری:

۱۔	۱۱۵۳ھ	3580 Addl.	۱۰۲	---	دیوان
۲۔	۱۲۱۲ھ	164	۹۱	---	دیوان
۳۔	۱۲۱۲ھ	40	۵۹	---	دیوان

نیشنل میوزیم۔ دہلی:

۱۔	---	۵۵۰۷۳/۲۰۵۳	۲۶۰ (نواب ٹونک کے ذخیرۂ کتب سے خریدا گیا وہاں اس کا نمبر شمار ۲۱۶ تھا)

شخصی ذخیرۂ کتب۔ آغا حیدر حسن۔ پروفیسر نظام کالج حیدر آباد:

۱۔	۲۸ جمادی الثانی	۱۲۸۷	---	---	دیوان

احسن مارہروی:

۱۔	۱۱۵۵ھ	---	---	---	دیوان

جہانگیر صاحب ۔ احمد آباد:

۱۔	۱۱۶۸ھ	---	---	---	دیوان

خلیل اللہ صاحب ۔ حیدر آباد:

۱۔	۱۱۵۵ھ	---	(خلیل صاحب نصیر الدین ہاشمی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں)

سید محمد (پروفیسر) حیدر آباد:

۱۔	---	---	---	---	دیوان

سید محمد بلگرامی ۔ آگرہ:

۱۔	---	---	---	---	دیوان
۲۔	۱۱۴ھ	---	---	---	دیوان

شمس اللہ قادری حکیم ۔ حیدر آباد:

۱۔	۱۱۹۹ھ	---	---	---	دیوان

غلام سجاد (مختار بدایونی):

۱۔	---	---	---	---	دیوان

غلام مصطفیٰ خاں ۔ بھوپال:

۱۔	۱۱۶۷ھ	---	---	---	دیوان

قاضی فضل عظیم ۔ ڈاکٹر ۔ کراچی:

۱۔	۳/ ربیع الاول ۱۱۶۱	---	۱۰۵	---	دیوان

گارساں دتاسی ۔ پیرس:

۱۔	---	M.E / 2821	۱۸۲	---	دیوان
۲۔	---	M.A / 2822	۱۸۲	---	دیوان
۳۔	---	M.D / 2823	۱۸۲	---	دیوان
۴۔	---	M.C / 2824	۱۸۲	---	دیوان
۵۔	----	M.F / 2825	۱۸۲	---	دیوان
۶۔	---	2826	۱۸۲	---	دیوان
۷۔	---	M6 / 2827	۱۸۲	---	دیوان
۸۔	---	MI /2828.۱۷۸۰	---	---	دیوان
۹۔	۱۷۸۰ء	2889	---	---	دیوان
۱۰۔	۱۸۳۲ء	2830	۲۵۷	---	دیوان

گور سرن لعل آزاد:

۱۔	۱۱۴۴ھ	---	---	---	دیوان

ناظم الدین نقوی ۔ کراچی:

۱۔	---	---	۱۵	---	دیوان

نصیر حسین خیال عظیم آبادی:

۱۔	۱۱۲۰ھ	---	۱۵	---	دیوان

محمد نور الدین خاں ۔ حیدر آباد:

۱۔ ۲/ ربیع الاول ۱۲۲۳	---	۱۳۱	---	دیوان

معین الدین عقیل ۔ ڈاکٹر ۔ کراچی:

۱۔ ۱۱/ ربیع الاول ۱۱۵۹	---	۱۴۱	---	دیوان

مرتبہ متون:

۱۔	دیوان ولی	گاساں دتاسی (دو جلدوں میں)	پیرس	۱۸۳۳ء
۲۔	دیوان ولی	غلام محمد سورتی ۔ مطبع حیدری	بمبئی	۱۸۷۳ء
۳۔	دیوان ولی	نول کشور پریس ۔	لکھنو	۱۸۷۸ء
۴۔	دیوان ولی	حیدر ابراہیم سایانی	--	۱۹۲۱ء
۵۔	دیوان ولی	احسن مارہروی ۔ انجمن ترقی اردو	اورنگ آباد	۱۹۲۷ء
۶۔	کلیات ولی	نور الحسن ہاشمی ۔ انجمن ترقی اردو	ہند	۱۹۴۵ء

انتخاب کلام ولی:

۱۔	انتخاب کلام ولی	سید ظہیر الدین مدنی مکتبہ جامعہ	نئی دہلی	۱۹۷۱ء
۲۔	اردو غزل ولی تک	سید ظہیر الدین مدنی	بمبئی	۱۹۶۱ء
۳۔	ریختہ ولی	نور الحسن ہاشمی	لکھنو	۱۹۷۱ء
۴۔	ولی	نور الحسن ہاشمی ساہتیہ اکیڈیمی	دہلی	۱۹۷۶ء
۵۔	مطالعہ ولی	شارب ردولوی (ڈائرکٹر) ۔ نصرت پبلشر	لکھنو	۱۹۷۲ء
۶۔	ولی شخصیت و فن اور کلام	ساحل احمد ۔ اردو رائٹر گلڈ	الہ آباد	۱۹۷۹ء
۷۔	یازدہ	ساحل احمد اردو رائٹرس گلڈ	الہ آباد	۱۹۷۸ء

ولی اور اس کے فن سے متعلق کتابیں:

۱۔ اشرف ۔ محمد خاں	ولی ۔ آزاد بک ڈپو امرتسر	تاریخ اشاعت ندارد	۱۲۸ صفحات
۲۔ امراد حسن فاروقی	حیات ولی ۔ نئی دہلی	۱۹۷۷ء	---
۳۔ ساحل احمد	ولی فن و شخصیت اور کلام ۔ الہ باد	۱۹۷۹ء	۱۲۸ صفحات
۴۔ سید محمد (مرتب)	یادگار ولی ۔ "الموسی" ۔ حیدرآباد	۱۳۴۶ف	۲۷۲ صفحات
۵۔ شارب ردولوی	مطالعہ ولی ۔ نصرت پبلشر ۔ لکھنو	۱۹۷۲ء	۲۱۶ صفحات
۶۔ ظہیر الدین مدنی	ولی گجراتی ۔ ادبی پبلشرز ۔ بمبئی	۱۹۵۰ء	۲۴۴ صفحات
۷۔ عبادت بریلوی	ولی اورنگ آبادی ۔ لاہور	۱۹۸۱ء	۲۲۵ صفحات

۸۔نواب علی	دی پامس جوگیشوری کالج بمبئی کا ولی نمبر	۱۹۳۰ء	ـــ
۹۔نورالحسن ہاشمی	ریختہ ولی۔لکھنو	۱۹۷۶ء	۸۰ صفحات
۱۰۔نورالحسن ہاشمی	ولی۔ساہتیہ اکیڈمی دہلی		ـــ

تحقیقی مقالے جن میں ولی کا تذکرہ ہے

۱۔اشرف محمد علی (ڈاکٹر)	دکنی غزل کی نشو نما (جامعہ عثمانیہ) پی ایچ ڈی	مطبوعہ ۱۹۸۶ء
۲۔جمال شریف (ڈاکٹر)	ولی اور اس سے پہلے کی شاعری دکن میں۔علی گڑھ یونیورسٹی۔پی ایچ ڈی	غیر مطبوعہ
۳۔جمیل جالبی (ڈاکٹر)	قدیم اردو ادب کا تحقیقی مطالعہ۔سندھ یونیورسٹی۔پی ایچ ڈی	مطبوعہ ۱۹۷۵
۴۔عابدہ مسعود (ڈاکٹر)	اردو میں نظریہ شاعری (ولی سے اقبال تک) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	غیر مطبوعہ
۵۔صالحہ بیگم	ولی کی شاعری میں ہندوستانی عناصر۔جامعہ عثمانیہ۔ایم فل	غیر مطبوعہ ۱۹۷۶ء
۶۔ظہیرالدین مدنی (ڈاکٹر)	سخنوران گجرات۔بمبئی یونیورسٹی۔مطبوعہ ترقی اردو بیورو	۱۹۸۱ء
۷۔فیضان دانش	کلام ولی کا فنی اور لسانی جائزہ۔پنجاب یونیورسٹی۔پی ایچ ڈی	غیر مطبوعہ
۸۔ملکہ پروین	ولی دکنی نثری تصانیف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پی۔ایچ ڈی	غیر مطبوعہ
۹۔نورالحسن ہاشمی	کلیات ولی ترتیب و تہذیب لکھنو یونیورسٹی۔ڈی لٹ	مطبوعہ ۱۹۴۵ء

ولی اور اس کے فن سے متعلق مضامین (کتابوں میں)

۱۔اشرف محمد علی (ڈاکٹر)	تحقیقی نقوش۔ولی کی شمالی ہندوستان کو دین۔۱۹۹۳ء حیدرآباد۔ص
۲۔اشرف محمد علی ڈاکٹر	دکنی غزل۔ولی اورنگ آبادی۔۱۹۸۶ء حیدرآباد ص ۲۰۲
۳۔اختر جوناگڈھی	مضامین اختر جوناگڈھی۔ولی گجراتی۔۱۹۸۹ء کراچی۔ص ۱۷
۴۔اختر جوناگڈھی	مضامین اختر جوناگڈھی۔ولی گجراتی (تصحیح و استدراک) ۱۹۸۹ء کراچی ص ۲۷
۵۔اختر جوناگڈھی	مضامین اختر جوناگڈھی۔ولی گجراتی (استدراک) ۱۹۸۹ء کراچی۔ص ۸۹
۶۔اختر جوناگڈھی	مضامین اختر جوناگڈھی۔دیوان ولی کا قدیم ترین مخطوطہ۔۱۹۸۹ء۔کراچی ص ۱۱۶
۷۔اختر جوناگڈھی	مضامین اختر جوناگڈھی۔کلیات ولی (طبع دوم) ۱۹۸۹ء۔کراچی۔ص ۱۳۱
۸۔اختر جوناگڈھی	مضامین اختر جوناگڈھی۔تذکرہ ولی۔۱۹۸۹ء کراچی۔ص ۱۷۸ء

۹۔اشرف محمد خاں ولی امرتسر تاریخ اشاعت ندارد ولی گجراتی ظہیرالدین مدنی) ص ۶

۱۰۔اشرف محمد خاں ولی امرتسر تاریخ اشاعت ندارد ولی کا سنہ وفات (عبدالحق ص ۲۸

۱۱۔اشرف محمد خاں ولی امرتسر تاریخ اشاعت ندارد جمال دوست اسلوب پرست ولی (سید عبداللہ) ص ۲۹

۱۲۔اشرف محمد خاں ولی امرتسر تاریخ اشاعت ندارد ولی کی غزل (وزیر آغا) ص ۵۸

۱۳۔اشرف محمد خاں ولی امرتسر تاریخ اشاعت ندارد ولی کی شاعری (عبادت بریلوی) ص ۷۳

۱۴۔اشرف محمد خاں ولی امرتسر تاریخ اشاعت ندارد ولی کی زبان (عبدالستار صدیقی) ص ۱۰۰

۱۵۔اشرف محمد خاں ولی امرتسر تاریخ اشاعت ندارد ولی کی شاعری کا اثر (نورالحسن ہاشمی) ص ۱۱۵

۱۶۔جمیل جالبی ادبی تحقیق ولی کا سال وفات ۔لاہور ۔۱۹۹۴ء ص ۲۶۱

ساحل احمد ۔یازدہ ۔ولی کے کلام کا جائزہ: الہ آباد ۔۱۹۷۸ء

سحر۔ابوالفیض (ڈاکٹر) تناظر اور تجزیے ۔لیکن ولی ولی ہے جہان سخن کے بیچ ۔دہلی ۱۹۸۹ء ص

سردار علی ۔تذکرہ شعرا ، اورنگ آبادی ۔ولی اورنگ آبادی ۔حیدر آباد ۱۹۲۹ء

طارق سعید ۔کلاسیکی شاعری کی تنقید ۔۱۹۹۱ء ۔علی گڑھ ۔جمال دوست اسلوب پرست ولی (سید عبداللہ) ص ۵۹

طارق سعید ۔کلاسیکی شاعری کی تنقید ۔۱۹۹۱ء ۔علی گڑھ ۔مقدمہ کلیات ولی (نورالحسن ہاشمی) ص ۶۱

طارق سعید ۔کلاسیکی شاعری کی تنقید ۔۱۹۹۱ء ۔علی گڑھ ۔ولی کی شاعری (عبادت بریلوی) ص ۶۳

طارق سعید ۔کلاسیکی شاعری کی تنقید ۔۱۹۹۱ء ۔علی گڑھ ۔ولی غزل (وزیر آغا) ص ۶۷

عبادت بریلوی ۔شاعری اور شاعری کی تنقید ایجوکیشنل بک ہاوز علی گڑھ ۔۱۹۵۷ء ۔ولی ۔ص ۳۷

ایجوکیشنل بک ہاوز علی گڑھ ۔۱۹۵۷ء ۔ولی ۔ص ۳۷

عبداللہ سید ڈاکٹر ۔ولی سے اقبال تک ۔جمال دوست اسلوب پرست ولی ۔لاہور ۱۹۷۶ء ص

غلام مصطفی خاں (ڈاکٹر) ۔علمی نقوش ۔دہلی ۱۹۸۱ء ۔ولی کا غیر مطبوعہ کلام ۔ص

محمد امین ۔ادب ، ادیب اور اصناف ۔علی گڑھ ۱۹۸۸ء ۔ولی کی شاعری ایک مختصر تعارف ص ۲۱۲

محمد حبیب خاں ۔ولی سے آتش تک ۔دہلی ۱۹۶۲ء ۔ولی کی غزل (وزیر آغا) ص

نصیرالدین ہاشمی ۔مقالات ہاشمی ۔لاہور ۱۹۳۹ء ۔ولی کا غیر مطبوعہ کلام ص ۱۵

یوسف سرمست (پروفیسر) ۔اردو ادب ۔آندھرا پردیش اوپن یونیورسٹی (نصاب سال دوم نظم) ولی کی غزلیں

ولی اور اس کے فن سے متعلق مضامین (رسائل میں)

آرزو مختار الدین احمد   کلیات ولی کا ایک نایاب نسخہ   " معاصر پٹنہ "   جون   ۱۹۴۳ء

اعظم محمد فاروق (ڈاکٹر)   ولی گجراتی ایک جائزہ   سابرنامہ -   احمد آباد   ۱۹۹۰ء

اثر محمد علی   فراقی معاصر ولی   "سب رس"   حیدرآباد   جنوری   ۱۹۹۳ء

اثر محمد علی (ڈاکٹر)   ولی کی شمالی ہندوستان کو دین "قومی زبان"   حیدرآباد   جنوری / فبروری   ۱۹۹۳ء

اختر جوناگڈھی - قاضی احمد میاں   ولی گجراتی   "معنف" (سہ ماہی)   علی گڈھ   اکتوبر   ۱۹۴۵ء

اکرام چغتائی   ولی گجراتی اور شاہ گلشن   "اردونامہ"   کراچی   مارچ   ۱۹۶۶ء

اکرام چغتائی   ولی گجراتی کا نام   "اردونامہ"   کراچی   ستمبر   ۱۹۶۶ء

اکرام چغتائی   ولی گجراتی کا غیر مطبوعہ کلام اردو (سہ ماہی)   کراچی   جنوری   ۱۹۶۷ء

باقی عبدالقیوم   ولی کا اسلوب -   المؤسی "ولی نمبر"   حیدرآباد   ۱۳۴۶ء   ف

تنہا - محمد یحیٰ -   غازی آبادی - ولی کا سنہ وفات - زمانہ -   کانپور   اپریل   ۱۹۳۴ء

تنہا - محمد یحیٰ   غازی آبادی - ولی کا سنہ وفات - اردو (سہ ماہی) کراچی   اپریل   ۱۹۵۱ء

جمیل جالبی (ڈاکٹر)   ولی کا سنہ وفات - جشن نامہ اورینٹل کالج   لاہور   ۱۹۷۲ء

حسینی پیر   ولی گجراتی   شباب   جوناگڈھ   اپریل   ۱۹۳۴ء

زور محی الدین قادری (ڈاکٹر)   ولی اورنگ آبادی - سب رس   حیدرآباد   اگست   ۱۹۴۲ء

زور محی الدین قادری (ڈاکٹر)   ولی کا وطن   معارف   اعظم گڈھ   شمارہ ۲   جلد ۵

زور محی الدین قادری (ڈاکٹر)   ولی کا وطن   المؤسی   حیدرآباد   خصوصی شمارہ   ۱۹۳۶ء

زور محی الدین قادری (ڈاکٹر)   ولی کی یاد کیوں منائی جاتی ہے   سب رس   حیدرآباد   ستمبر   ۱۹۴۳ء

زور محی الدین قادری (ڈاکٹر)   ولی اورنگ آبادی اور ولی گجراتی   آج کل   دہلی   ستمبر   ۱۹۵۲ء

سخاوت مرزا   خروشی معاصر ولی   "اردو روزنامہ"   کراچی   جنوری تا اپریل   ۱۹۶۰ء

سروری - عبدالقادر (پروفیسر)   ولی کے تلامذہ   (ولی نمبر)   حیدرآباد   ۱۳۴۶   ف

شطاری سید حمید الدین   ولی اورنگ آبادی   نظام ادب   حیدرآباد   جولائی   ۱۹۶۶ء

صدیقی محمد اکبر الدین   ولی اور غواصی   تذکرہ   کراچی   فروری   ۱۹۸۵ء

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام / تاریخ
طیب انصاری (ڈاکٹر)	ولی کی عظمت	"سب رس"	حیدرآباد جولائی ۱۹۶۶ء
عالی جعفری	شہر بمبئی کے کتب خانوں میں دیوان ولی کے نسخے	"نوائے ادب"	بمبئی جولائی ۱۹۵۲ء
عبدالحق مولوی	ولی کا سنہ وفات	اردو (سہ ماہی)	جنوری تا اپریل ۱۹۳۳ء
عبدالحق مولوی	ولی کا سنہ وفات	الموسی (ولی نمبر)	حیدرآباد ف ۱۳۴۶ء
عبدالمنان	ولی غزل کے آئینے میں	"سب رس"	حیدرآباد جولائی ۱۹۶۶ء
عبدالواحد ابوظفر	ولی کی شاعری	الموسی (ولی نمبر)	حیدرآباد ف ۱۳۴۶
عقیل معین الدین	ولی کا غیر مطبوعہ کلام	"اردو"	جنوری ۱۹۷۶ء
غلام مصطفیٰ خاں (ڈاکٹر)	ولی گجراتی کا کچھ غیر مطبوعہ کلام	معارف	اعظم گڈھ اگست ۱۹۴۵ء
گارسیں دتاسی	ولی اور اس کی شاعری	الموسی ولی نمبر	حیدرآباد ف ۱۳۴۶
مدنی۔ظہیرالدین سید	ولی کی علمی استعداد	اردو (سہ ماہی)	جنوری ۱۹۴۷ء
مدنی۔ظہیرالدین سید	ولی کے مرغوب فارسی شعرا	اردو (سہ ماہی)	جنوری ۱۹۴۷ء
مدنی۔ظہیرالدین سید	رسالہ نورالمعرفت۔	اردو (سہ ماہی)	جولائی ۱۹۴۷ء
مدنی۔ظہیرالدین سید	ولیؔ کی شاعری	اردو (سہ ماہی)	جولائی ۱۹۵۶ء
نذر مصطفیٰ	ولی کے احباب، تلامذہ اور ان کا وطن	نوائے ادب	بمبئی اکتوبر ۱۹۵۳ء
نصیرالدین ہاشمی	ولی کا غیر مطبوعہ کلام	ہندوستانی	الہ آباد ۱۹۳۲ء
نصیرالدین ہاشمی	ولی کے پہلے دکنی شاعری	ساقی	جون ۱۹۳۲ء
نصیرالدین ہاشمی	ولی سے پہلے اردو شاعری	نگار	لکھنو جنوری ۱۹۲۵ء
نصیرالدین ہاشمی	ولی سے پہلے دکنی غزلیں	ساقی	جون ۱۹۳۲ء

ولی کا ذکر تذکروں میں

۱۔ آب حیات۔ محمد حسین آزاد۔ الہ آباد۔ ۱۹۸۰ء۔ ص ۸۸

۲۔ انتخاب دواوین۔ امام بخش صہبائی۔ دہلی ۱۳۰۰ء۔ ص ۲۴۹

۳۔ تاریخ ادبیات پاکستان و ہند۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور۔ ۱۹۷۲ء

۴۔ ترجمہ مخزن نکات۔ میر۔ مخطوطہ۔ رضا لائبریری رام پور ص ۶۲۔ ص ۲۶

۵۔ تذکرہ بے جگر۔ عیراتی لال بے جگر۔ مخطوطہ۔ انڈیا آفس۔ لندن (ردیف و) ص ۲۶

۶۔ تذکرہ بیل۔ تھامس ولیم بیل (انگریزی) اورینٹل بائیوگرافیکل ڈکشنری۔ کلکتہ۔ ۱۸۸۱ء

۷۔ تذکرہ ریختہ گویاں ۔ سید فتح علی حسینی گردیزی ۔ عبدالحق ۔ اورنگ آباد ۱۹۳۳ء ۔ ص ۱۴۴

۸۔ تذکرہ شعرا ۔ شاد عظیم آبادی ۔ عطا الرحمن کاکوی ۔ پٹنہ ۱۹۶۵ء

۹۔ تذکرہ شعرائے اردو ۔ میر حسن ۔ حبیب الرحمن خاں شیروانی ۔ دہلی ۔ ۱۹۴۰ء ۔ ص ۱۸۴

۱۰۔ تذکرہ شعرائے اورنگ آباد ۔ محمد سردار علی ۔ حیدرآباد ۔ ۱۹۲۶ء

۱۱۔ تذکرہ شعرائے دکن ۔ عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری ۔ حیدرآباد ۔ ۱۳۲۹ء

۱۲۔ تذکرہ شورش ۔ کلیم الدین احمد پٹنہ ۔ تاریخ اشاعت ندارد (جلد دوم) ص ۳۰۰

۱۳۔ تذکرۂ عشقی ۔ مشمولہ ۔ کلیم الدین احمد پٹنہ ۔ تاریخ اشاعت ندارد ۔ (جلد دوم) ص ۳۰۱

۱۴۔ تذکرہ معرکہ سخن ۔ عبدالباری آسی ۔ لکھنؤ ۱۹۳۴ء

۱۵۔ تذکرۂ نادر ۔ مرتبہ سید مسعود حسین رضوی ادیب ۔ لکھنؤ ۱۹۵۷ء ۔ ص ۱۷۷

۱۶۔ جلوۂ خضر ۔ صفیر بلگرامی ۔ (جلد اول) ۔ آرہ ۱۳۰۲ھ

۱۷۔ جواہر سخن ۔ کیفی چریاکوٹی (جلد اول) الہ آباد ۔ ۱۹۳۳ء

۱۸۔ چمنستان شعرا ۔ لچھمی نرائن شفیق ۔ عبدالحق ۔ اورنگ آباد ۔ ۱۹۲۸ء ص ۱۰۴

۱۹۔ خوش معرکۂ زیبا ۔ سعادت علی خاں ناصر ۔ مشفق خواجہ ۔ (جلد دوم) لاہور ۱۹۷۲ء ۔ ص ۵۶۸

۲۰۔ دیوان جہاں ۔ بینی نرائن جہاں ۔ کلیم الدین احمد ۔ پٹنہ ۔ سنہ اشاعت ندارد ص ۲۴۹ ۔ ص ۱۰۴

۲۱۔ دیوان الفردوس ۔ محمد حسن خاں ۔ مرتضیٰ حسین فاضل ۔ لاہور ۔ ۱۹۸۶ء ۔ ص ۱۰۱

۲۲۔ ریاض الفصحا ۔ غلام ہمدانی مصحفی ۔ عبدالحق ۔ اورنگ آباد ۔ ۱۹۳۴ء

۲۳۔ شمیم سخن ۔ محمد عبدالحی ۔ صفا بدایونی (حصہ اول) مرادآباد سال طباعت درج نہیں)

۲۴۔ طبقات شعرا ۔ قدرت اللہ شوق ۔ نثار احمد فاروقی ۔ لاہور ۱۹۶۸ء ۔ ص ۵ ۔ ۲۴۴ ص ۵ ۔ ۲۴۴

۲۵۔ طبقات الشعرائے ہند ۔ کریم الدین / فلیق ۔ دہلی ۔ ۱۸۴۸ء ۔ ص ۳۸

۲۶۔ عمدۂ منتخبہ ۔ اعظم الدولہ ۔ محمد خاں سرور ۔ خواجہ احمد فاروقی ۔ دہلی ۱۹۶۱ء ۔ ص ۱۰۸

۲۷۔ عیار الشعرا ۔ خوب چند ذکا ۔ غیر مطبوعہ مخطوطہ انڈیا آفس لندن ۔ ص ۸۲۴

۲۸۔ قاموس المشاہیر ۔ نظامی بدایونی ۔ بدایوں (جلد دوم) ۱۹۲۶ء ۔ ص ۲۷۹

۲۹۔ گل رعنا ۔ سید الحیٰ اعظم گڈھ ۔ ۱۳۷۰ھ ص ۶۱

۳۰۔ گلشن بے خار ۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ ۔ لکھنؤ ۱۸۷۴ء ۔ ص ۲۳۷

۳۱۔ گلشن سخن ۔ مرداں علی خاں مبتلا ۔ مسعود حسین رضوی ۔ علی گڈھ ۱۹۶۵ء ۔ ص ۲۴۷

۳۲۔ گلشن گفتار۔ حمید اورنگ آبادی۔ سید محمد حیدرآباد۔ ۱۳۲۹ف۔ ص ۳

۳۳۔ گلشن ہند۔ حیدر بخش حیدری۔ مختار الدین احمد۔ دہلی ۱۹۶۷ء۔ ص ۳۵

۳۴۔ گلشن ہمیشہ بہار۔ نصراللہ خاں خویشگی۔ اسلم فرخی۔ کراچی ۱۹۶۷ء۔ ص ۲۲۵

۳۵۔ گلدستہ نازنیان۔ کریم الدین احمد لاری۔ پٹنہ۔ ۱۹۷۲ء۔ ص ۳۵

۳۶۔ مجمع الانتخاب۔ شاہ محمد کمال۔ نثار احمد فاروقی۔ دہلی ۱۹۶۸ء۔ ص ۱۳۹

۳۷۔ مخزن نکات قائم چاندپوری۔ اقتدار حسن لاہور ۱۹۶۶ء۔ ص ۲۱

۳۸۔ مخزن الشعرا۔ قاضی نورالدین حسین۔ عبدالحق، دہلی ۱۹۳۳ء۔ ص ۱۱۰

۳۹۔ مراۃ الشعرا۔ محمد۔ یحییٰ تنہا۔ لاہور تاریخ اشاعت ندارد۔ ص ۲۷

۴۰۔ نسخہ دلکش۔ راجہ جنم جے متر ارمان (جلد دوم) کلکتہ۔ ص ۸۷

۴۱۔ نکات الشعرا۔ میر تقی میر۔ عبدالحق۔ اورنگ آباد۔ ۱۹۳۵ء۔ ص ۱۰۱

۴۲۔ یادگار الشعرا۔ اشپرنگر۔ مترجم طفیل احمد۔ ہندوستانی اکیڈیمی۔ الہ آباد۔ ۱۹۴۳ء۔ ص ۱۱

حوالے و حواشی:

۱۔ یہ نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانے کی زینت ہے اور ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء کا تحریر کردہ ہے

۲۔ یہ نسخہ کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور میں محفوظ ہے اور ۱۱۳۸ھ / ۱۷۲۵ء کا مکتوبہ ہے۔

۳۔ نورالحسن ہاشمی۔ ولی۔ ص ۱۳

۴۔ کلیات ولی۔ ص

۵۔ کلیات ولی۔ ص ۱۴

۶۔ ولی کے ایک قریبی دوست سید محمد فراقی نے اپنی مثنوی "مراۃ الحشر" (۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۰ء) میں مرحوم شعراء کا تذکرہ کیا ہے جسمیں ولی کا نام شامل نہیں ہے۔

۷۔ ولی کے شاگرد رشید ثناء اللہ نے اپنے مکتوبہ "دیوان ولی" کے قلمی نسخے میں ولی کو مرحوم لکھا ہے۔ یہ نسخہ ۱۱۳۸ھ / ۱۷۲۵ء کا مکتوبہ ہے۔

۸۔ آب حیات صفحہ ص ۸۴ ۹۔ سہ ماہی "اردو" کراچی اکتوبر ۱۹۶۶ء۔

۱۰۔ جائزہ مخطوطات اردو۔ لاہور ص ۱۸۷ ۱۱۔ جائزہ مخطوطات اردو۔ ص ۱۸۷

۱۲۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول) ص ۵۵۷

۱۳۔ تجہ مثال اے سراج بعد ولی کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

۱۴- کہتے ہیں سب اہلِ سخن اس شعر کوں سن کر
تجہ طبع میں داود ولی کا

۱۵- سخت مشکل ہے اے عزیزاں ہو
شعر کہنا ولی کے مضموں کا

۱۶- شعر کہنے میں ہے اشرف کوں ولی کا مرتبہ
اس سبب شاعراں اس کے مرید

۱۷- سن ریختہ ولی کا دل خوش ہوا ہے صابر
حقاز فکر روشن ہے انوری کے مانند

۱۸- دیکھ دلبر مجھے کہا ہے اے قربی
جگ میں بے شک ولی ثانی ہے

۱۹- پروانہ جل تراب ہوا سو عجب ہے کیا
روشن چراغ دل سوں ولی کا سخن ہوا

۲۰- حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولی ولی ہے جہانِ سخن

۲۱- آبرو شعر ہے ترا اعجاز
پر ولی کا سخن کرامت ہے

۲۲- ریختہ کہنے کے فن میں مبتلا
کچھ ولی ہور شوقیا سوں کم نہیں

۲۳- خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

○ ○ ○

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس

نقوش اثر
(سوانحی اخبار و کوائف)

نام - محمد علی　　تخلص - اثر　　والد بزرگوار - حکیم مولوی شیخ محبوب صاحب مرحوم
والدہ محترمہ - غفور النساء بیگم صاحبہ　　تاریخ پیدائش - ۲۲/ دسمبر ۱۹۴۹ء　　مقام پیدائش - حیدر آباد

تعلیمی سفر

میٹرک	:	۱۹۶۶ء اردو شریف ہائی اسکول - حیدر آباد
پی یو سی	:	۱۹۶۸ء انوار العلوم ڈگری کالج - حیدر آباد
بی - اے	:	۱۹۷۱ء انوار العلوم ڈگری کالج - حیدر آباد
ایم - اے	:	۱۹۷۴ء عثمانیہ یونیورسٹی - درجہ اول مع امتیاز گولڈ میڈلسٹ
پی - ایچ - ڈی	:	۱۹۸۰ء عثمانیہ یونیورسٹی - موضوع "دکنی غزل" نگران: پروفیسر غلام عمر خاں
مخطوطہ شناسی کا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما		۱۹۸۴ء عثمانیہ یونیورسٹی

سلسلہ درس و تدریس

۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء	جز وقتی لکچرر، شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۲ء	ایڈہاک لکچرر، شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۷ء	مستقل لکچرر، شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
۱۹۸۷ء تا حال	ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

سیر و سفر

امریکہ		جون ۱۹۸۸ء
انگلینڈ	:	دسمبر ۱۹۸۸ء

تاہل وازدواج:

تاریخ تزویج : ۳۰ / اپریل ۱۹۷۶ء مطابق ۲۹ / ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ
شریک حیات : محترمہ راحت سلطانہ ایم ۔ اے (جامعہ عثمانیہ)
سینیر اسسٹنٹ ڈپارٹمنٹ آف ٹکنیکل ایجوکیشن ۔ حیدرآباد ۔
دختر قاری مولوی محمد عبدالعلی فاروقی صاحب مرحوم

ابناو بنات:

۱۔ کہکشاں ناز ۲۔ محمد عادل فراز ۳۔ ثریا نشاط ۴۔ شائستہ ناہید ۵۔ محمد سہیل افروز

ارتسامات فکر و نظر:

۱۔ غواصی، شخصیت اور فن (تحقیق) ۱۹۷۷ء ۲۔ ملاقات (شعری مجموعہ) ۱۹۸۰ء۔
۳۔ شمع جلتی رہے (رپورتاژ) ۱۹۸۰ء ۴۔ دبستان گولکنڈہ، ادب اور کلچر (مرتبہ) ۱۹۸۱ء۔
۵۔ دکنی اور دکنیات (وضاحتی کتابیات) مدراس یونیورسٹی کے نصاب میں شامل۔
۶۔ تذکرہ اردو مخطوطات، ادارۂ ادبیات اردو (جلد ششم) ۱۹۸۳ء بہ اشتراک محمد اکبرالدین صدیقی۔
۷۔ دکنی غزل کی نشوونما (تحقیق) ۱۹۸۶ء مدراس یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ کے نصاب میں شامل۔
۸۔ دکنی اور دکنیات (وضاحتی کتابیات) پاکستان ایڈیشن ۱۹۸۶ء مقتدرہ "قومی زبان" ۔اسلام آباد۔
۹۔ دکنی کی تین مثنویاں (تحقیق و تدوین) ۱۹۸۷ء مدراس یونیورسٹی کے نصاب میں شامل۔
۱۰۔ دکنی شاعری۔ تحقیق و تنقید (مضامین کا مجموعہ) ۱۹۸۸ء۔
۱۱۔ کلیات ایمان (تحقیق و تدوین) ۱۹۸۸ء مرتبہ سیدہ ہاشمی ترمیم و اضافہ محمد علی اثر۔
۱۲۔ نظیر شناسی (مرتبہ) ۱۹۸۸ء بہ اشتراک ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ ۔جامعہ عثمانیہ کے نصاب میں شامل۔
۱۳۔ حرف نم دیدہ (شاعری) ۱۹۹۰ء۔
۱۴۔ تحقیقی نقوش (تحقیق و تنقید) (مضامین کا مجموعہ) ۱۹۹۳ء۔
۱۵۔ خامہ در خامہ (مرتبہ) ۱۹۹۳ء ۔علیم صبا نویدی کی غزل گوئی کا جائزہ۔
۱۶۔ جنوب کا شعرو ادب علیم صبا کے مضامین ۔(مرتبہ) ۱۹۹۵ء۔
۱۷۔ بنام علیم صبا نویدی (مکاتیب) مرتبہ ۱۹۹۶ء۔
۱۸۔ نوادرات تحقیق (تحقیقی مضامین) ۔۱۹۹۶ء۔

زیر طبع:

۱۔ دکنی غزل کا انتخاب
۲۔ تذکرہ مخطوطات (جلد اول) مرتبہ ڈاکٹر زور ترمیم و اضافہ محمد علی اثر

سمینار، سمپوزیم اور مشاعرے

۱۔ المنائی سوسائٹی علی گڈھ کے زیر اہتمام شکاگو (امریکہ) میں منعقد ہونے والے عالمی مشاعرے میں شرکت کی اور کلام سنایا۔ ۱۹۸۸ء
۲۔ گجرات ودیاپیٹھ کے زیر اہتمام احمد آباد میں منعقد ہونے والے سہ روزہ سمینار "گجری، ہندوستانی اور دکنی اردو" میں شرکت کی اور مقالہ پڑھا۔ ۱۹۹۱ء
۳۔ ظہیر آباد میں منعقد ہونے والے ادبی اجلاس اور مشاعرے کی صدارت کی ۱۹۹۲ء
۴۔ وشاکھاپٹنم میں منعقد ہونے والے کل ہند مشاعرے میں کلام سنایا۔ ۱۹۹۳ء
۵۔ شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے خصوصی امدادی پروگرام کے زیر اہتمام "دکنی مثنوی" پر منعقد ہونے والے سہ روزہ قومی سمینار (۲۶ تا ۲۸/ اکتوبر ۹۴ء) میں مقالہ پیش کیا اور مشاعرے میں کلام سنایا۔
۶۔ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں "طریقہ تحقیق" کے موضوع پر منعقد ہونے والے سمپوزیم میں مقالہ پیش کیا۔ ۱۹۹۴ء
۷۔ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے خصوصی امدادی پروگرام کے زیر اہتمام "جنوبی ہند میں دکنی کے موضوع پر منعقد ہونے والے کل ہند دو روزہ سمینار میں مقالہ پیش کیا۔ دسمبر ۱۹۹۵ء
۸۔ ایوان ادب اردو کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے کل ہند نعتیہ مشاعرے میں کلام سنانے کی سعادت حاصل کی۔ ۱۹۹۶ء
۹۔ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے دسمبر ۹۵ء اور نومبر ۹۶ء میں منعقد ہونے والے ریفرشر کورس کے اساتذہ کے لیے لکچرز دیے

انعامات واعزازات:

۱۔ رائے جانکی پرشاد میموریل گولڈ میڈل، ایم۔اے (اردو) میں یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے پر۔ ۱۹۷۲ء
۲۔ اتر پردیش گورنمنٹ پرائز (گولڈ میڈل)۔ ایم۔اے (اردو) میں یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے پر۔ ۱۹۷۲ء
۳۔ آندھراپردیش اردو اکیڈمی کا ادبی انعام برائے تحقیقی تصنیف "مقواسی شخصیت اور فن" پر ۱۹۷۷ء
۴۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا ادبی انعام برائے شعری تصنیف "ملاقات" پر۔ ۱۹۸۰ء
۵۔ آندھراپردیش اردو اکیڈمی کا ادبی انعام برائے شعری تصنیف "ملاقات" پر ۱۹۸۰ء
۶۔ آندھراپردیش اردو اکیڈمی کا ادبی انعام برائے کتابیات "دکنی اور دکنیات" پر ۱۹۸۲ء
۷۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی کا ادبی انعام برائے تحقیقی تصنیف "دکنی غزل" پر ۱۹۸۶ء
۸۔ بہار اردو اکیڈمی کا ادبی انعام برائے تحقیقی تصنیف "دکنی غزل" پر ۱۹۸۶ء

۹۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا ادبی انعام برائے تحقیقی تصنیف "دکنی غزل" ۱۹۸۶ء

۱۰۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کا ادبی انعام برائے تحقیقی تصنیف "دکنی غزل" ۱۹۸۶ء

۱۱۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کا ادبی انعام برائے تحقیقی تصنیف "دکنی شاعری" ۱۹۸۸ء

۱۲۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا ادبی انعام برائے شعری تصنیف "حرف نم دیدہ" ۱۹۹۰ء

۱۳۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کا ادبی انعام برائے شعری تصنیف "حرف نم دیدہ" ۱۹۹۰ء

۱۴۔ بہار اردو اکیڈمی کا انعام برائے تحقیقی تصنیف "تحقیقی نقوش" ۱۹۹۳ء

علمی اداروں اور ادبی انجمنوں سے وابستگی:

۱۔ ممبر بورڈ آف اسٹڈیز۔شعبہ۔ اردو۔عثمانیہ یونیورسٹی (۱۹۸۵-۸۹ء)

۲۔ ممبر بورڈ آف اسٹڈیز۔شعبہ۔ اردو، فارسی اور عربی۔آندھرا یونیورسٹی۔وشاکھاپٹنم (۱۹۹۲-۹۴ء)

۳۔ ممبر بورڈ آف اسٹڈیز۔شعبہ۔ اردو گلبرگہ یونیورسٹی۔گلبرگہ (۱۹۹۳-۹۵ء)

۴۔ ممبر بورڈ اکزامنرس شعبہ۔ اردو گلبرگہ یونیورسٹی۔گلبرگہ (۱۹۹۴-۹۵ء)

۵۔ ممبر شعبہ۔ امتحانات۔ادارۂ ادبیات اردو۔حیدرآباد۔ (۱۹۸۹-۹۵ء)

۶۔ ممبر شعبہ۔ تصنیف و تالیف۔ادارۂ ادبیات اردو۔حیدرآباد۔ (۱۹۹۶ء)

۷۔ صدر ایوانِ اردو۔ریاست نگر۔حیدرآباد۔ (۱۹۹۵ء)

مختلف زبانوں کے نامور مصنفین کی ڈائرکٹری میں سوانحی کوائف کی شمولیت:

۱۔ INDO AMERICAN WHO.S WHO ۔ (1994)

۲۔ REFERENCE ASIA (Vol. VII) ۔ (معہ تصویر) ۔ (1995)

۳۔ BIOGRAPHY INTERNATIONAL (1996)

۴۔ INDO ARAB WHO.S WHO (1996)

۵۔ ہندوستان کے مصنفین اور شعرا۔اردو اکیڈمی دہلی۔۱۹۹۶ء۔

تاثرات اہل نظر

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی:

ڈاکٹر محمد علی اثر بر عظیم کے ان محققوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ جنھوں نے دکنی اور دکنیات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔۔۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کی تحقیق میں گہرائی بھی ہے اور تنقیدی شعور بھی اور ایک اچھے مصنف کی طرح اپنی تحقیق کو اچھے اسلوب میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی۔

۲۔ مشفق خواجہ

اہل تحقیق کرم خوردہ مخطوطات اور شغل گور کنی میں ایسے منہمک رہتے ہیں کہ کبھی کوئی خوب صورت خیال ان کے قریب آنے کی جسارت نہیں کرتا۔ اچھے شعر کہنا تو کجا انھیں اچھے شعروں سے محظوظ ہونے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ لیکن محمد علی اثر کا معاملہ بالکل مختلف ہے وہ تحقیق اور شاعری دونوں کا حق ادا کرتے ہیں۔ اثر صاحب تحقیق کرتے ہیں تو ماضی میں سانس لیتے ہیں، شاعری میں وہ جدید ترین دنیا کے شہری ہیں۔ کسی ایک شخص میں ایسا توازن کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

۳۔ پروفیسر غلام عمر خاں:

ڈاکٹر محمد علی اثر دکنی شعر و ادب کے میدان میں انہماک اور وقف شدگی کے ساتھ تحقیقی کام میں مصروف ہیں۔ ان کی بعض کتابوں کو اہم ماخذوں کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ملک کی دوسری زبانوں میں بھی ان کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں۔ ملک کے باہر بھی ان کتابوں کی مانگ ہے اور وہاں ان کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ان کی بعض کتابیں مختلف یونیورسٹیوں کے تحقیقاتی درجوں میں شامل نصاب بھی ہیں۔

۴۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی:

"دکنی غزل کی نشو و نما" کی حیثیت چراغ رہ گذر کی سی ہے جس سے ہمارے علم میں اضافہ ہی نہیں بلکہ تحقیق کی نئی راہیں بھی کھلتی ہیں۔

۵۔ پروفیسر معین الدین عقیل (وزیٹنگ پروفیسر ٹوکیو یونیورسٹی جاپان):

"اردو تحقیق۔ اور خصوصاً اس کا دبستان دکن ڈاکٹر محمد علی اثر کا ممنون رہے گا۔ ان کی ایسی دریافتوں سے اور تلاش و جستجو کی بدولت۔ کچھ عجب نہیں کہ اردو تحقیق کے دبستان دکن کا یہ دور آئندہ خود ان کے نام اور ان کی نمائندگی سے بھی موسوم ہو جاتے۔

۶۔ پروفیسر گیان چند جین:

"دکنی غزل پر آپ کا کام بے نظیر ہے۔ "دکنی اور دکنیات" ہر وقت میری میز پر رکھی رہتی ہے کہ میں اسے حوالے کی کتاب کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

۷۔ پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد:

آپ نے دکنی زبان و ادب کی تحقیق پر قابل قدر کام انجام دیا ہے آپ قابل مبارکباد ہیں کہ استاد محترم ڈاکٹر زور مرحوم کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور ان کے سچے جانشین بننے کا آپ ہی کو حق پہنچتا ہے۔

۸۔ پروفیسر وارث علوی:

محمد علی اثر کے تحقیقی کارناموں نے دکنی اور گجری ادب کی بازیافت میں نمایاں عطیہ پیش کیا ہے۔ اثر ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر بھی ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ تحقیق کی عرق ریزی کے ساتھ وہ شاعری کی گوہر ریزی کا کام کیسے کر لیتے ہیں۔ وہ اتنے مخلص آدمی ہیں کہ ان کی رفاقت سرمایہ حیات میں اضافے سے کم نہیں۔

۹۔ پروفیسر محمد انصار اللہ:

ڈاکٹر اثر نے اپنے شریفانہ مزاج سے نثر اور نظم دونوں میں فائدہ اٹھایا ہے۔ نثر میں انھوں نے تحقیق سے کام لیا ہے یعنی خذف ریزوں میں سے موتی چنے ہیں۔ اور نظم میں انھوں نے مشرق و مغرب میں رونما ہونے والے واقعات سے متعلق اپنے تاثرات کو موتیوں کی آبداری عطا کر کے ہر خاص و عام کے لیے دل چسپی اور کیف و لطف کا سبب بنا دیا ہے۔

○ ○ ○

قطعہ تاریخ طباعت نوادرات تحقیق

تصنیف استاذی ڈاکٹر محمد علی اثر ریڈر شعبہ اردو - جامعہ عثمانیہ

○

ماضی نے اپنے رخ سے الٹا نقاب گویا
لفظوں کے پیرہن میں ہے آفتاب گویا

ہراک ورق پہ رقصاں کرنوں کی انجمن ہے
تاریخ فکر و فن کا ہے انتخاب گویا

مخطوطوں اور بیاضوں میں جو ادب نہاں تھا
نظروں کے سامنے ہے وہ بے حجاب گویا

جو خامہ اثر سے نکلا ہے پر اثر ہے
تحقیق و آگہی سے ہے انتساب گویا

تاریخ وہ ملی ہے جس میں کمی نہیں ہے
تحقیق معتبر کی ہے یہ کتاب گویا

۱۴۱۷ھ

ڈاکٹر عباس متقی

